ایک نیزہ خونِ دل

انیس اشفاق

ایک نیزہ خونِ دل

انیس اشفاق

سرورق	:	ژاں کوکتو (از معطرباغ نیاوران تہران)
پہلی اشاعت	:	مئی، ۲۰۱۹ء
ناشر	:	انیس اشفاق
کمپوزنگ	:	عزیز الرحمٰن
طباعت	:	ایڈورٹائزرس انڈیا، لکھنؤ
قیمت	:	۴۰۰/روپے
فروخت	:	کتاب والا، پہاڑی بھوجلہ، دہلی
		ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
		ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
		دانش محل، لکھنؤ

Eik Naiza Khoon-e-Dil

By

Anis Ashfaq

'گل زمین' 4/158، وپل کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ-226010

موبائل:9451310098

ای-میل:s.anisashfaq@gmail.com

معروف مزاح نگار

اظہر مسعود

کے نام

جو

اپنے بڑے بھائی نیر مسعود ہی کی طرح صائب الرائے ہیں

© انیس اشفاق

سرورق : ژاں کوکتو (از معطر باغ نیاوران، تہران)

پہلی اشاعت : مئی، ۲۰۱۹ء

ناشر : انیس اشفاق

کمپوزنگ : عزیز الرحمٰن

طباعت : ایڈورٹائزرس انڈیا، لکھنؤ

قیمت : ۴۰۰/روپے

فروخت : کتاب والا، پہاڑی بھوجلہ، دہلی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

دانش محل، لکھنؤ

Eik Naiza Khoon-e-Dil

By

Anis Ashfaq

'گل زمین' 4/158، وپل کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ-226010

موبائل:9451310098

ای-میل:s.anisashfaq@gmail.com

معروف مزاح نگار

اظہر مسعود

کے نام

جو

اپنے بڑے بھائی نیر مسعود ہی کی طرح صائب الرائے ہیں

''جن چیزوں سے کلام میں اثر پیدا ہوتا ہے وہ شعر میں علاحدہ علاحدہ نہیں ہوتیں بلکہ وہ سب یا ان میں سے چند ترکیبی حالت میں پائی جاتی ہیں۔ ان کی ترکیب سے شعر میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہی شعر کی روح ہوتی ہے۔''

'ہماری شاعری'

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب

"Poetry is a language pared down to its essentials."

Ezra Pound

۶۰ء کے دہے کے آخری سالوں میں ادبی زندگی
کا آغاز شاعری سے کیا پھر افسانے لکھنا شروع کیے۔
شعر و افسانہ کی تخلیق تھم تھم کر ساتھ ساتھ ہوتی رہی۔ بعد
ازاں تنقید کی طرف طبیعت مائل ہوئی، تنقید شاعری اور
افسانے کی تخلیق میں حائل ہوئی۔ رسالوں میں باقاعدگی
سے چھپے بغیر رک رک کر کہی جانے والی یہ اچھی بری
غزلیں اب آپ کے سامنے ہیں۔

عرفی نوائے مرغ تو در ہیچ باغ نیست
ایں نغمہ خاصۂ چمنِ اختراعِ ماست

عرفی شیرازی

اندر کے اشعار سے

دستک پہ اب گھروں سے کوئی بولتا نہیں
پہلے یہ شہر شہرِ عدم رفتگاں نہ تھا

جو ساعتِ نمود وہی وقتِ رفت و بود
دریا میں کتنی دیر سفر ہے حباب کا

جوہر بغیر قیمتِ آئینہ کچھ نہیں
آئینہ لے بھی آئیں تو جوہر کہاں سے لائیں

اس کی مٹھی میں جواہر تھے نظر میری طرف
اور مجھے پیرایۂ عرضِ ہنر آتا نہ تھا

ہر طرف گہری سیاہی ہے محیطِ عشق میں
ایک شمعِ دل کے بجھنے سے دھواں کتنا ہوا

ہم تیرے آسمان میں اے حرفِ اعتبار
اڑنا تو چاہتے ہیں مگر پر کہاں سے لائیں

تو کیا ہوا جو گلا یہ رسن میں رہنے لگا
مزہ تو دانۂ حق کا دہن میں رہنے لگا

ترتیب

حمد

خداوندا! مرے تن میں رہے میرا لہو زندہ
اگر میرا لہو زندہ تو میری جستجو زندہ

بیک ساعت مکاں سے لامکاں تک روشنی پھیلی
کہا اک لفظِ کن تو نے ہوا یہ دشتِ ہُو زندہ

یہاں تو صرف سناٹا تھا یہ کس کی صدا گونجی
کہ دشت وکوہ سب جاگے ہوئے سب کاخ وکو زندہ

مگر نقشِ فنا اب بھی مٹائے سے نہیں مٹتا
فضائے نیستی باقی ہوائے تندخو زندہ

دعا کا وقت آتا ہے تو میں خاموش رہتا ہوں
مگر سینے میں رہتی ہے دعا کی آرزو زندہ

یہ شامیں تیرا مرکز ہیں یہ صبحیں تیرا مسکن ہیں
شفق میں روشنی زندہ گلوں میں رنگ و بو زندہ

یہ تیرا نام کیوں میری مناجاتوں میں روشن ہے
یہ میرے حرف میں کس واسطے رہتا ہے تو زندہ

سحر کو سب پرندے جب تری تسبیح پڑھتے ہیں
چمن میں ہر طرف ہوتی ہے تیری گفتگو زندہ

نہ تو منظر میں پوشیدہ نہ میں تصویر سے غائب
میں تیرے سامنے حاضر تو میرے روبرو زندہ

شجر تیرے چمن کا سبز موسم کی نشانی ہو
ثمر آثار شاخوں میں رہے ذوقِ نمو زندہ

پہلی مطبوعہ غزل بہ عمر ۱۷ سال

ماہنامہ 'کتاب' لکھنؤ، فروری ۱۹۷۰ء

احساس کی آواز خیالوں کی چبھن ہوں
میں وقت کے ماتھے پہ اک ہلکی سی شکن ہوں

ہے خون میں ڈوبا ہوا نیزہ مری پہچان
میں عصر میں ڈوبے ہوئے سورج کی کرن ہوں

پانی نہ کیا جس نے طلب نہر پہ آ کر
دریا ہو خجل جس سے میں وہ تشنہ دہن ہوں

میں شہرِ تبسم سے کہیں دور بہت دور
اشکوں کے سلگتے ہوئے قطروں کا وطن ہوں

تابوت میں رکھی ہوئی اک لاش کی مانند
خود اپنے لیے موت کی زہریلی گھٹن ہوں

یوں خوفزدہ شہر کے افراد ہیں مجھ سے
جیسے میں کوئی زہر میں لپٹا ہوا تن ہوں

ذہنوں پہ لپکتا ہوں کسی ناگ کی مانند
بوسیدہ خیالوں کے لیے موت کا پھن ہوں

سورج کے نگر سے میں تپش لے کے چلا تھا
اب لوگ یہ کہتے ہیں اجالوں کا بدن ہوں

عیسیٰ کے طلبگار زمانے کو بتادے
اے خوں بھری شب میں قمرِ دار و رسن ہوں

ایک نیزہ خونِ دل

نیّر مسعود کی یاد میں

آنکھوں میں سیلِ نور کا منظر نہیں رہا
روشن جو تھا فلک پہ وہ نیّر نہیں رہا

لائیں گے کوئی موجِ معانی کہاں سے ہم
جس میں یہ موج تھی وہ سمندر نہیں رہا

ملتی تھی جس سے داروئے عرفان و آگہی
دانش کے میکدے میں وہ ساغر نہیں رہا

خالی نہ ایک پل رہا تیرا مکانِ فیض
تھا ہم میں کون جو یہاں آکر نہیں رہا

جس کی چمک سے لفظ کو ملتی تھی روشنی
گنجینۂ سخن میں وہ گوہر نہیں رہا

لاتا تھا موتیوں کو جو تہہ سے نکال کر
دریائے عِلم کا وہ شناور نہیں رہا

غالب ہوں میر ہوں کہ یگانہ ہوں یا انیس
کوئی بھی اس کی فہم سے باہر نہیں رہا

ہر دم وہاں تھا نور کی آیات کا نزول
خالی کبھی وہ خانۂ خاور نہیں رہا

تکیے پہ اپنے خوش تھا وہ اللہ کا فقیر
طالب منال و مال کا یکسر نہیں رہا

بیعت تھے جس کے ہاتھ پہ نکتہ ورانِ شہر
وہ پیر وہ ولی وہ قلندر نہیں رہا

گُل تو بہت ہیں صحنِ چمن میں کھلے ہوئے
لیکن گلوں میں اب وہ گلِ تر نہیں رہا

ہوتی تھیں جس پہ آیۂ معنی کی قرأتیں
خالی پدر کے بعد وہ منبر نہیں رہا

یوں تو بہت بلند تھے اہلِ قلم کے قد
لیکن کوئی بھی اُس کے برابر نہیں رہا

فردوں میں جس کی جمع تھے خورشید کے ورق
علم و کمال و فن کا وہ دفتر نہیں رہا

شاداں تھے جس کو دیکھ کے سب رہروانِ شوق
اب راہ میں وہ میل کا پتھر نہیں رہا

اس سے زیادہ دل کا زیاں ہوگا اور کیا
اب کوئی نقش نور کا دل پر نہیں رہا

اونچا ہوا جو اب کے ہمارا علم تو کیا
دیکھے گا کون صاحب لشکر نہیں رہا

کہتے تھے جس سے دل کی خرابی میں دل کا حال
وہ غمگسار و مونس و یاور نہیں رہا

نوحہ پڑھو کہ اٹھ گیا دانائے روزگار
ماتم کرو کہ مہر منور نہیں رہا

○

سواری مہر کی وادیِ ہوئے رفتگاں میں ہے
عجب اک روشنی سی دیکھ کوئے رفتگاں میں ہے

معطّر کر گئی میرے چمن کے سارے پھولوں کو
نہ جانے کون سی تاثیر بوئے رفتگاں میں ہے

پتہ لکھا نہ لوحِ جستجو پر اپنی منزل کا
خودی کیسی فنا آموز خوئے رفتگاں میں ہے

میں اُس کو ڈھونڈتا ہوں اور وہ موجِ ستارہ جو
شعاعِ مہر سی رخشندہ جوئے رفتگاں میں ہے

اُنہیں کے حرف میں ہیں نیستی کی ساری تعبیریں
عدم کا رمز روشن گفتگوئے رفتگاں میں ہے

○

فرشِ فنا کی آنکھ میں جلوۂ رمزِ رائیگاں
خاکِ خراب پر مرا نقشِ زوال لازوال

موسمِ حرف کی ہوا بوئے نموئے نو سے نم
کشتِ سخن ہمیشہ سبز فصلِ کمال لازوال

میں اسی دام میں اسیر میں وہی صیدِ کم نظیر
میری اڑان عرش گیر اور پر و بال لازوال

قیدِ طلسمِ جاں میں ہوں حیرتِ رائیگاں میں ہوں
خواب ترا حریفِ مرگ تیرا خیال لازوال

جوہرِ جاں کی تاب ہے گوہرِ دل کی آب ہے
شیشۂ لمس میں ترا عکسِ وصال لازوال

دستِ ثبات اٹھا کے اب کارِ فنا کو روک دے
کون و مکاں میں کر بھی دے سب خد و خال لازوال

○

موجِ خوں صرفِ قلم کرتا ہوں میں
شہر کا نوحہ رقم کرتا ہوں میں

شمع روشن ہے مگر اب اس کی لو
تیز ہوتی ہے تو کم کرتا ہوں میں

غم نہیں ہے تیرے جانے کا مجھے
آنکھ نم کرنا ہے نم کرتا ہوں میں

دور تک صحرا میں روشن ہے غبار
دشت کی رونق میں رم کرتا ہوں میں

جس کی ہر آیت ثمر آثار ہو
وہ دعا شاخوں پہ دم کرتا ہوں میں

پھر وہاں سے خلعت و زر چاہیے
پھر جبیں اس در پہ خم کرتا ہوں میں

○

خامۂ خوں سے اگر اک ورقِ زر لکھتے
ہم بھی اے حرفِ ہنر خود کو سخنور لکھتے

دیدۂ دہر سے دنیا کا تماشا کرتے
حیرتِ حرف سے حیرانیِ منظر لکھتے

ایک نیزہ مرے ہونے کی گواہی دیتا
سرِ علم ہوتا تو سب مہرِ منوّر لکھتے

والیِ شہر کی توصیف کے پابند قلم
فرش کو عرش تو قطرے کو سمندر لکھتے

جب ترے شہر سے جاتی رہی توقیرِ سخن
داد کس بات کی ملتی جو سخنور لکھتے

آخرش نامہ نویسوں نے قلم روک لیے
ایک ہی بات کہاں تک وہ مکرّر لکھتے

شہر میں کوئی تو ہوتا جسے اپنا کہتے
اور خط اس کو محبت کے برابر لکھتے

○

کیسی ہے یہ تشنہ دہانی
دشت ہوا ہے پانی پانی

سبز ہوا اس شہر کا موسم
اس نے پہنے کپڑے دھانی

بگڑے کام بنا دیتی ہے
میٹھی بولی اچھی بانی

میرا گھر خوشبو سے خالی
اس کے گھر میں رات کی رانی

دشت کا جانا ہم نے چھوڑا
دیکھ کے شہروں کی ویرانی

شہر میں یوں معشوق بہت ہیں
کوئی نہیں ہے تیرا ثانی

عشق کیا کر کے پچھتایا
اس نے کوئی بات نہ مانی

یہیں کہیں میرا بھی گھر تھا
بستی ہے جانی پہچانی

اس کے بدن کی آنچ کے آگے
عشق نہ ہو جائے ہیجانی

سب ہیں رفت و بود کی زد میں
میں بھی فانی تو بھی فانی

پڑھیے تو سب کے شعروں میں
لفظ نئے ہیں بات پرانی

کہاں سے تم کو لے کر آئیں
کہاں گئیں تم امی جانی*

---

* والدۂ ماجدہ : ذاکیہ بیگم

○

رات تھی گہری نہ تھی رنگ تھا کالا نہ تھا
عکس پسِ آئینہ دیکھنے والا نہ تھا

خاک نے پیکر کوئی نور میں ڈھالا نہ تھا
تن پہ سفیدی نہ تھی من میں اجالا نہ تھا

خوشبوئیں اڑتیں کدھر رنگ نکھرتا کہاں
خون ہوا کی طرف ہم نے اچھالا نہ تھا

نیند پشیماں نہ تھی خواب پریشاں نہ تھے
عکس گہِ چشم سے اس کو نکالا نہ تھا

اب ہے لہو کا ستم ہم ہیں نہ جاہ و حشم
تیغ کو دیکھا نہ تھا سر کو سنبھالا نہ تھا

خود سے لپٹتے گئے خود میں الجھتے گئے
چھوٹتے کیونکر بھلا جال تھا جالا نہ تھا

○

یہ ہم جو حرف گزیدہ کتاب رکھتے ہیں
اسی میں عہدِ زیاں کا حساب رکھتے ہیں

ہے اپنی عمرِ گزشتہ ہمیں عزیز بہت
بغل میں پارۂ عہدِ شباب رکھتے ہیں

تو اور شیخ سے کیا پوچھتا میں اس کے سوا
شراب تھوڑی سی عالی جناب رکھتے ہیں

اسی پہ تکیہ نشیں ہیں شہانِ ماہ و نجوم
جو بوریا ترے خانہ خراب رکھتے ہیں

پھر اس میں آرزو و جستجو کا مطلب کیا
وہ زندگی جو مثالِ حباب رکھتے ہیں

ہماری مشکِ محبت نہ خشک ہوگی کبھی
سرشکِ خوں سے اسے ہم پُر آب رکھتے ہیں

اب اور دولتیں کیا چاہیے فقیروں کو
نہ دل میں خوف نہ آنکھوں میں خواب رکھتے ہیں

یہ اہلِ شہر بہت لائے خوش جمالوں کو
کہاں وہ حسن میں تیرا جواب رکھتے ہیں

یہ کیسے لوگ ہیں، ہیں تو حضورِ شاہ مگر
دلوں میں آرزوے انقلاب رکھتے ہیں

○

ایسا بھی تیز نشترِ نامہرباں نہ تھا
یوں زخم زخم چہرۂ افتادگاں نہ تھا

وہ پیاس تھی کہ حلق سے باہر تھی ہر زباں
اور دور تک کہیں کوئی دریا رواں نہ تھا

دستک پہ اب گھروں سے کوئی بولتا نہیں
پہلے یہ شہر شہرِ عدم رفتگاں نہ تھا

اب کے تھے کارزار میں سب آشنا حریف
لیکن وہ خوش قتیل کہ شکوہ کناں نہ تھا

خاموش ساعتوں میں تھی روشن تری صدا
ٹھہرا ہوا تھا وقت مگر رائیگاں نہ تھا

بارانِ تیز میں بھی رہے آشیانہ سوز
صحنِ چمن میں ہم سا کوئی تفتہ جاں نہ تھا

○

عشق پیشہ ہیں تو نقصان اٹھاتے رہیے
پاس جتنا بھی زرِ دل ہے لٹاتے رہیے

پیشِ خورشید کھلی رکھیے کتابِ گلشن
آیتِ پارۂ گل روز سناتے رہیے

لکھ کے لے جایئے اک تازہ قصیدہ ہر روز
خلعت و منصب و زرشاہ سے پاتے رہیے

تیز ہے شعلۂ شب خاک نہ ہو جائیں مکاں
رات بھر سارے مکینوں کو جگاتے رہیے

رکھیے ہر حال میں یہ شمعِ تعلق روشن
اور لَو اس کی جہاں تک ہو بڑھاتے رہیے

دام اس باغ سے جب تک نہ اٹھالیں صیّاد
ان پرندوں کو فضاؤں میں اڑاتے رہیے

تا نہ آئے کبھی خنجر کی روانی میں کمی
میرے سینے پہ نئے زخم لگاتے رہیے

ٹوٹنے دیجے نہ یہ سلسلۂ آمدِ نور
شمع ظلمت کدۂ شب میں جلاتے رہیے

ہم تو محکوم ہیں ہر ظلم پہ چپ ہیں اور آپ
حاکمِ شہر ہیں سو خون بہاتے رہیے

لوگ دیکھیں گے کہاں ایسے لہو کے منظر
سب کو اس شہر کی تصویر دکھاتے رہیے

ہو اگر حوصلہ تو کیجیے کج اپنی کلاہ
ورنہ سر جیسے جھکاتے ہیں، جھکاتے رہیے

لشکر اس شہر کو ویران کیا چاہتے ہیں
آپ کو جشن منانا ہے مناتے رہیے

○

عشق میں وہ بت اگر تلوار ہوتا جائے گا
دل مرا شائستۂ پیکار ہوتا جائے گا

خوشبوؤں سے پیڑ کی شاخیں مہکتی جائیں گی
ایک اِک غنچہ ثمر آثار ہوتا جائے گا

دیکھنے والوں کی آنکھیں بند ہوتی جائیں گی
اور ہر منظر پسِ دیوار ہوتا جائے گا

دھیرے دھیرے دھوپ نقطے میں سمٹتی جائے گی
آسماں پر ابر گوہر بار ہوتا جائے گا

صبح دم اجلے پرندے شاخ پر آ جائیں گے
اور پھر سارا شجر بیدار ہوتا جائے گا

دیکھتا جائے گا مڑ مڑ کر مجھے میرا غزال
اور نظر کا تیر دل کے پار ہوتا جائے گا

ساحلوں پر دھوپ کی پریاں نہاتی جائیں گی
قامتِ آبِ رواں سرشار ہوتا جائے گا

○

یہ میری بستی میں کیا ہوا ہے
جسے بھی دیکھو ڈرا ہوا ہے

ہمارے اس خانۂ الم میں
جو ہے وہ تیرا دیا ہوا ہے

علم ہمارا گرا نہیں ہے
علم ہمارا اٹھا ہوا ہے

مری تری بے تعلقی میں
عجب تعلق بنا ہوا ہے

سب اس کے ٹانکے اُدھڑ گئے ہیں
یہ زخم کس کا سیا ہوا ہے

ہم آج کیا اُٹھ گئے ہیں جلدی
کہ آج سورج چُھپا ہوا ہے

کبھی تو آؤ کہ گھر ہمارا
تمہارے گھر سے ملا ہوا ہے

میں اپنی ضد پر ڈٹا ہوا ہوں
وہ اپنی ہٹ پر اَڑا ہوا ہے

ڈھلے گا دن تو غروب ہوگا
ابھی جو سورج چڑھا ہوا ہے

جو میکدے میں نئے ہیں ان کو
ذرا سی پی کر نشہ ہوا ہے

جبینیں اُن کی گھسی ہوئی ہیں
جنہیں یہ خلعت عطا ہوا ہے

ہیں پھول زخموں کے ہر شجر پر
چمن ہمارا کھلا ہوا ہے

تمہاری یادوں کی خوشبوؤں سے
بدن ہمارا بسا ہوا ہے

نہ جانے کل بستیوں میں کیا ہو
ابھی تو خطرہ ٹلا ہوا ہے

کہاں ہماری ہے جیب خالی
خودی کا سکّہ پڑا ہوا ہے

غزل یہ کیسی کہی ہے تم نے
جو شعر ہے وہ ڈھلا ہوا ہے

○

چھوڑ یہ پیشہ اس پیشے میں پہلی سی وہ بات کہاں ہے
کارِ ہنر میں دل زخمی ہے عرضِ ہنر میں جاں کا زیاں ہے

چار طرف جو آگ لگی ہے میری ہی سلگائی ہوئی ہے
اٹھتا ہے جو سب کے گھروں سے یہ میرے ہی گھر کا دھواں ہے

ایک چراغ اور ایک چٹائی اس سے زیادہ کچھ نہیں بھائی
ہم سا خوش آموزِ قناعت رکھتا بھی کچھ اور کہاں ہے

کس کا کس بستی میں گھر ہے کس قریے سے کس کا گزر ہے
جب سے اُجڑے شہر ہمارے کون بتائے کون کہاں ہے

دور طلسموں کے منظر اور ایک خزانہ اُن کے پیچھے
سانپ ہواؤں میں اڑتے ہیں اور زمیں پر خون رواں ہے

تیرے چمن میں رات کو ہم نے ایک عجب آواز سنی تھی
اب کے شاید کوئی پرندہ خانۂ گل میں گریہ کناں ہے

تیرے لمس کے مہتابوں سے میرے جسم کی وادی روشن
کل تک جو تاریک پڑا تھا اب وہ قریہ نور فشاں ہے

منیر نیازی کے لئے

مری ہی آنکھیں مرے سراپا پہ ہنس رہی تھیں
جب آئینے سے غبار اترا تو میں نے دیکھا

سناں تھی سینے کے سرخ سیلِ رواں میں روشن
فرس سے جب شہسوار اترا تو میں نے دیکھا

حریف ظاہر میں اور اندر سے میرا مونس
جب اس کی آنکھوں کے پار اترا تو میں نے دیکھا

کماں تھی ٹوٹی، تھا خالی ترکش جو میرا دشمن
فصیل سے شرمسار اترا تو میں نے دیکھا

ہوا پروں پر سجا کے لائی تھی ایک سورج
زمیں پہ وہ زرنگار اترا تو میں نے دیکھا

تمام شاخیں برہنہ سر تھیں جو اب کے موسم
شجر سے بے برگ و بار اترا تو میں نے دیکھا

حلیف میرا حریف نکلا جو اس کے تن سے
لبادۂ اعتبار اُترا تو میں نے دیکھا

○

چھوڑ یہ پند بادہ خواری کر
شیخ رندوں سے تھوڑی یاری کر

گھٹنے پائے نہ لو تعلق کی
دشمنوں سے بھی دوست داری کر

ظلم پھر ہو رہا ہے چار طرف
تیغ پھر کھینچ جاں سپاری کر

نقد دے جو بھی مجھ کو دینا ہے
دل کے سودے میں مت اُدھاری کر

ہر طرف دشمنوں کے لشکر ہیں
رات بھر جاگ پہرہ داری کر

عشق شیریں طلب ہے پھر، فرہاد
بیستوں کاٹ نہر جاری کر

ہو بھی جا میرے دامِ عشق میں قید
اب زیادہ نہ ہوشیاری کر

کم ہوا ہے ابھی کہاں مرا غم
اور کچھ دیر غمگساری کر

کچھ تو رکھ پاسِ نالہ و فریاد
آگے سب کے نہ آہ و زاری کر

آ کے بازارِ جاں میں کچھ تو خرید
کچھ تو میری بھی جیب بھاری کر

○

دل میں وہ پرہول سناٹا رہا تیرے بغیر
ہر نئی آہٹ سے خوف آتا رہا تیرے بغیر

کب ہوا آباد جاناں یہ ترے جانے کے بعد
خانۂ دل عمر بھر سونا رہا تیرے بغیر

پوچھ تو اُس شہر سے آ کر کبھی مجھ سے کہ میں
کس طرح اس شہر میں تنہا رہا تیرے بغیر

تو گیا تو راحتوں کی چھاؤں بھی جاتی رہی
میں سلگتی دھوپ میں بیٹھا رہا تیرے بغیر

کب ہوا اِس وقت سے بیماریِ دل کا علاج
کون کہتا ہے کہ میں اچھا رہا تیرے بغیر

ہوں وہیں جس خیمۂ منظر میں تیرے ساتھ تھا
تو گیا تو وقت بھی ٹھہرا رہا تیرے بغیر

جس کے لب سے تیری موجِ لب کبھی ہٹتی نہ تھی
وہ سرِ دریا بہت پیاسا رہا تیرے بغیر

جاں فزا تھے تیری یادوں کے خنک جھونکے سو میں
اس بلا کی دھوپ میں زندہ رہا تیرے بغیر

تو جو ہوتا سامنے تو وہ اٹھا لیتی اسے
طشتِ گُل پیشِ صبا رکھا رہا تیرے بغیر

تیرے دم سے تھیں منور جن چراغوں کی لویں
اُن چراغوں سے دھواں اٹھتا رہا تیرے بغیر

چھین لیں دستِ جدائی نے مری سب دولتیں
میری جیبِ زندگی میں کیا رہا تیرے بغیر

روز دل کے بحر میں ہوتا رہا موجوں کا شور
روز طوفانِ بلا اٹھتا رہا تیرے بغیر

کون تیری طرح مجھ پر کھولتا مشکِ بدن
سو میں ساری زندگی تشنہ رہا تیرے بغیر

ہجر کی تپتی زمیں پر دوریوں کے دشت میں
وحشتوں کے پھول برساتا رہا تیرے بغیر

کب ہوئیں شاخیں ہری کب آئے ان پر برگ و بار
باغِ دل کا ہر شجر سوکھا رہا تیرے بغیر

وہ جو چُن کے رکھ لیے تھے کچھ ترے حرفوں کے پھول
بس اُنہیں سے خود کو مہکاتا رہا تیرے بغیر

○

جلد اس شہر میں ہے وقت وہ آنے والا
ہم سے ڈر جائے گا خود ہم کو ڈرانے والا

کل وہی شہر میں شعلوں کو ہوا دیتا تھا
ہم سمجھتے تھے جسے آگ بجھانے والا

وقت ہر دور میں تاریخ نئی لکھتا ہے
مٹ نہ جائے کہیں خود ہم کو مٹانے والا

اٹھ کھڑے ہوں گے اگر ظلم کے مارے ہوئے لوگ
پھر نہ آئے گا کوئی تجھ کو بچانے والا

تو کسی اور طرف کوچ کی تیاری کر
ہے کوئی اور ترے تخت پہ آنے والا

کوئی ہوتا نہیں زنجیرِ ستم سے آزاد
وہ ستایا ہوا ہو یا ہو ستانے والا

بھول جاتا ہے کہ ہاتھ اس کے بھی جل جائیں گے
وہ جو ہے ظلم کے شعلوں کو بڑھانے والا

اُس سے ہر خون کے قطرے کا خدا لے گا حساب
حشر میں جائے گا جب حشر اٹھانے والا

چپ یہ حق والے نہ بیٹھے ہیں نہ بیٹھیں گے کبھی
سُن لے ہونٹوں پہ مرے مہر لگانے والا

اے پرندو! تمہیں ہشیار کیے دیتے ہیں
پھر نیا جال ہے صیاد بچھانے والا

پٹ چکے سب ترے مہرے اب اٹھا اپنی بساط
کھیل ہے ختم ترا، مات ہے کھانے والا

ہم پہ جو زخم لگے ہیں سو لگے ہیں لیکن
ایک دن خون میں تو بھی ہے نہانے والا

میں کروں تیرے لیے جمع زر و لعل و گہر
اور تو میرے خزانوں کو لٹانے والا

یوں ترے شہر میں فریاد سنی جاتی ہے!
پا بہ زنجیر ہے زنجیر ہلانے والا

کیا عجب ریت کی دیوار سا خود بھی گر جائے
میرے گھر کے در و دیوار گرانے والا

○

رات ہوئی تو ایک عجب سا منظر میں نے دیکھا
والیِ شہر کے ہاتھوں میں بھی خنجر میں نے دیکھا

شاخ شاخ پر قفس بنائے بیٹھے تھے صیاد
دل کے ہرے بھرے جنگل میں اڑ کر میں نے دیکھا

اپنے ہی سرداروں پر جو تانے ہوئے تھا نیزے
اب کے دشت میں ایسا بھی اک لشکر میں نے دیکھا

ایک اجالے کی خوشبو سے مہکیں میری صبحیں
ایک ستارہ اپنے گھر کے اوپر میں نے دیکھا

اُسی نے سوئے نہر مجھے مشکیزہ دے کر بھیجا
اور اُسی کا پہرہ بھی دریا پر میں نے دیکھا

جس کے سارے طاقوں میں تھیں روشن خوف کی شمعیں
شہر کی تاریکی میں اب کے وہ گھر میں نے دیکھا

موسم کی موسیقی سن کر جاگے ہوئے باغوں میں
رقص کناں ہر شاخ پہ اک گل پیکر میں نے دیکھا

○

پارۂ قصۂ گزشتہ ہوں
میں بھی مانندِ عمرِ رفتہ ہوں

پوچھ مجھ سے نہ میرا حال کہ میں
پا شکستہ ہوں دست بستہ ہوں

کوچۂ عشق جس کا مسکن تھا
میں وہی میرِ دل شکستہ ہوں

برقِ جاں نے جلادیا مجھ کو
دیکھیے جس طرف سے تفتہ ہوں

ٹکڑے ٹکڑے ہوا ہے میرا جگر
اب جو ہوں میں تو جستہ جستہ ہوں

کوئی مجھ کو پڑھے تو کیسے پڑھے
صورتِ پارہ ہائے خستہ ہوں

عشق جب سے ہوا ہے مجھ کو انیسؔ
سوختہ جاں ہوں دل گرفتہ ہوں

○

جب بھی گھر سے نکلوں سب کے ہاتھ میں خنجر دیکھوں
کب تک اپنی آنکھوں سے میں لہو کے منظر دیکھوں

کتنے دن سے چیخ رہا ہے قلعۂ دل میں کوئی
کتنے دن سے سوچ رہا ہوں اندر جا کر دیکھوں

ایک پرندہ کالی آنکھوں والا میرے اوپر
میں جس کے پنجوں کی زد میں اپنے شہپر دیکھوں

پہلی شام نے زرد شجر کی شاخ کو چھوکر پوچھا
ڈھل جانے سے پہلے تجھ کو میں بھی دم بھر دیکھوں

ایک علم آئینہ میرا اور میں ایک اکیلا
آنکھ اٹھاؤں چار طرف دشمن کے لشکر دیکھوں

طاق و در میں روشن کر کے تعبیروں کی شمعیں
روز مکانِ چشم میں اپنے خواب منوّر دیکھوں

جس موسم میں اس کے بدن کا باغ ہرا ہو جائے
اس موسم میں اپنے دل کا باغ معطّر دیکھوں

ساعتِ شب میں ایک ستارہ بن کر میں بھی چمکوں
اڑتی ہوئی کچھ نور کی پریاں تیرے فلک پر دیکھوں

○

نے قصرِ جم نہ خانۂ قیصر نظر میں ہے
ہم جس کو چھوڑ آئے وہی گھر نظر میں ہے

روشن ہزار رنگ کا پیکر نظر میں ہے
حیراں ہے آنکھ آئینہ منظر نظر میں ہے

جلتے ہوئے پروں کی سیاہی شفق پہ ہے
شعلوں میں راکھ ہوتا ہوا گھر نظر میں ہے

ہے معرکہ تو ختم مگر آسماں ہے سرخ
نیزے پہ آفتاب ہے، جو سر نظر میں ہے

طاؤس کے پروں پہ ہیں چنگاریوں کے پھول
جنگل کی شاخ شاخ شرر، شرنظر میں ہے

دنیا میں اپنی آنکھ کھلی رکھ نہ اتنی دیر
منظر نہ ہے جو یہاں کا وہ دم بھر نظر میں ہے

○

کیا مدح میں اس کے لب اظہار سے نکلا
ہاتھوں میں گہر لے کے وہ دربار سے نکلا

بازار میں لایا تھا بہت لفظ کے موتی
سکّہ نہ کوئی جیب خریدار سے نکلا

سرنامۂ سختیِ سفر لکھنے کی خاطر
میرا ہی لہو دشت کے ہر خار سے نکلا

کس کس کو نہ اُس چشم کی گردش نے کیا قتل
بچ کر نہ کوئی تیغِ طرحدار سے نکلا

اس نے بھی کبھی ہاتھ اٹھایا نہ ستم سے
میں بھی نہ کبھی عشق کے آزار سے نکلا

میں ڈھونڈ رہا تھا اسے افلاک پہ لیکن
خورشید تری آتشِ رخسار سے نکلا

سَو ہاتھ جب اپنوں کے بڑھے قتل کو میرے
اک ہاتھ بچانے صفِ اغیار سے نکلا

تاراجیِ دل کا ہو کہ مسماریِ جاں کا
جو حکم بھی نکلا تری سرکار سے نکلا

بو ایسی ہواؤں میں تھی اس بار لہو کی
کوئی نہ پرندہ صفِ اشجار سے نکلا

آخر کو مرا خانۂ دل ہوگیا روشن
اقرار کا سورج ترے انکار سے نکلا

تھے جادۂ ظلمت پہ سفر میں سبھی لیکن
خورشید مری گرمیِ رفتار سے نکلا

○

دل پہ کچھ اور زخم کھانے دے
کچھ مجھے اور مسکرانے دے

دیکھ سورج نکلنے والا ہے
ہوگئی صبح مجھ کو جانے دے

جنگ دشمن سے اب ضروری ہے
تیغ اپنی مجھے اٹھانے دے

قصر اپنے بلند کر لیکن
بے زمینوں کو بھی ٹھکانے دے

رکھ نہ یوں بند سارے دروازے
خانۂ دل میں اس کو آنے دے

یہ لٹانے سے کم نہیں ہوتی
دولتِ حرف ہے لٹانے دے

ایک چھوٹی سی چھت ہمیں بھی کہیں
کہیں ہم کو بھی سر چھپانے دے

ہر طرف تیرے شہر ہیں آباد
بستیاں کچھ ہمیں بسانے دے

چھیڑ مت اُن پرانے قصوں کو
بات بگڑے گی، چھوڑ، جانے دے

وہ مرا ہی رہے گا، لوگ اسے
ورغلاتے ہیں ورغلانے دے

تیشہ ٹھہرا ہے شرطِ عشق اگر
ہاتھ مجھ کو بھی آزمانے دے

سب کو آئندگاں کی دے سوغات
مجھ کو گزرے ہوئے زمانے دے

نقل اسلوب کی جو کرتے ہیں
اُن کو مضمون بھی چرانے دے

شعر کی سلطنت رہے دائم
لفظ و معنی کے وہ خزانے دے

○

یہ اضطرابِ عشق میں کیا کر رہا ہوں میں
اس کی گلی میں روز صدا کر رہا ہوں میں

کوئی بھی مرے حرفِ برہنہ سے نہیں خوش
سچ بول کر سبھی کو خفا کر رہا ہوں میں

لے اب سے تو ہی کر مری حاجت روائیاں
لے اب سے تجھ کو اپنا خدا کر رہا ہوں میں

اس درجہ اس کے عشق میں ہوں بستۂ وفا
اس کی وفاکشی سے وفا کر رہا ہوں میں

کیسا ہوں سادہ لوح کہ بے قامتوں کے بیچ
ہر روز اپنے قد کو بڑا کر رہا ہوں میں

اٹھے ہوئے ہیں نوکِ سناں پر بھی دونوں ہاتھ
دنیا سمجھ رہی ہے دعا کر رہا ہوں میں

یوں کب کسی کو خوں میں نہانے کا شوق ہے
اپنی زمیں کا قرض ادا کر رہا ہوں میں

دے لی ہیں جب سے یار نے کانوں میں انگلیاں
نالے کو اپنے اور رسا کر رہا ہوں میں

تو اے پرندِ ناز بہت دن سے ہے اسیر
جا تجھ کو قیدِ جاں سے رہا کر رہا ہوں میں

کچھ تو بھی چاہتا ہے رہے میرے دل سے دور
کچھ تیری آرزو بھی سوا کر رہا ہوں میں

○

لکھنا ہے تو جھوٹی کوئی روداد نہ لکھیے
صحرا کے پرندے کو چمن زاد نہ لکھیے

چپ کوچہ و بازار ہیں خاموش در و بام
جو شہر ہے ویراں اسے آباد نہ لکھیے

ہر جسم کی زنجیر دکھائی نہیں دیتی
ہر جسم کو زنجیر سے آزاد نہ لکھیے

جس شہر کو نسبت ہو کسی شہرِ عدو سے
اچھا ہے کہ اُس شہر کے اعداد نہ لکھیے

ہیں سارے قلم شہر میں اس شرط پہ آزاد
جو شاد نہیں ہیں انہیں ناشاد نہ لکھیے

ہر صاحبِ تیشہ نہیں شائستۂ کاوش
ہر کشتۂ پرویز کو فرہاد نہ لکھیے

لکھیں کوئی عرضی تو ہم عرضی میں لکھیں کیا
ہے شاہ کا فرمان کہ فریاد نہ لکھیے

○

دریائے خوں سے یا تو گزر جانا چاہیے
یا پھر اسی میں ڈوب کے مر جانا چاہیے

یہ کیا کہ عمر عشقِ بتاں میں گزار دی
اچھا سا کوئی کام بھی کر جانا چاہیے

کوئی پکارتا ہے تجھے دل کے اُس طرف
دل ہی سے پوچھ تجھ کو اُدھر جانا چاہیے

لوٹ آئے ہیں درختوں کی شاخوں پہ سب پرند
دن ڈھل چکا ہے مجھ کو بھی گھر جانا چاہیے

کیا شہرِ شورِ ظلم میں میں بھی رہوں خموش
کیا تیری طرح مجھ کو بھی ڈر جانا چاہیے

اس قریۂ ستم میں بدن پر نہ رکھ اسے
وہ وقت آ گیا ہے کہ سر جانا چاہیے

شہ کے وظیفہ خوار ہیں سارے خبر نگار
خبروں میں ایک یہ بھی خبر جانا چاہیے

تھوڑی سی پی کے نشہ نہ تجھ کو چڑھے گا شیخ
ہاتھوں میں جو سبو ہے وہ بھر جانا چاہیے

جب ختم ہو چکا حق و باطل میں امتیاز
کیسے کہوں کہ مجھ کو کدھر جانا چاہیے

تو ہی بتا گھرا ہو اگر دشمنوں میں دوست
منہ پھیر کے اُدھر سے گزر جانا چاہیے

○

شب میں گریے پسِ دیوار کہاں ہوتے ہیں
اب دلِ زار کو آزار کہاں ہوتے ہیں

یہ جو صحرا ہیں یہ گلزار کہاں ہوتے ہیں
ابر اٹھتے ہیں گہر بار کہاں ہوتے ہیں

کوئی جادو تری زنجیر میں ہوگا ورنہ
ہم سے آزاد گرفتار کہاں ہوتے ہیں

شہر میں صاحبِ شمشیر بہت ہیں لیکن
ظلم سے برسرِ پیکار کہاں ہوتے ہیں

ہم تو مقتل میں اُنہیں روز بلاتے ہیں مگر
لوگ سر دینے کو تیار کہاں ہوتے ہیں

جو نہ آئے سرِ بازار نمائش کے لیے
لوگ اس شے کے خریدار کہاں ہوتے ہیں

خاک ہوجاتے ہیں جب شہر تو ہوش آتا ہے
لوگ پہلے سے خبردار کہاں ہوتے ہیں

○

زندگی کتنی آدمی کی ہے
سچ بتاؤں تو دو گھڑی کی ہے

روشنی جیسی حرف میں اس کے
ساری تاثیر خوش لبی کی ہے

کیوں یہاں ہر طرف اندھیرا ہے
مملکت یہ تو روشنی کی ہے

اپنے ہی گھر میں رہ رہا ہوں مگر
یہ رہائش اک اجنبی کی ہے

میری حالت پہ دکھ تو ہے اس کو
پر کمی آنکھ میں نمی کی ہے۔

ہے جو سازش مرے مٹانے کی
یہ نہیں ایک کی، کئی کی ہے

تیز چل کر بھی چھاؤں کیا ملتی
دشت میں دوڑ، دھوپ ہی کی ہے

چاند سورج ہوں دونوں ہاتھوں میں
یہ تمنا تو ہر کسی کی ہے

گھوم پھر کر اِدھر ہی آتا ہوں
کشش ایسی تری گلی کی ہے

یہ جو ہے میرے پاس دولتِ غم
یہ عطا کی ہوئی اسی کی ہے

○

کمال فن میں ہنر گفتگو میں باقی ہے
سخن کا رمز ابھی لکھنؤ میں باقی ہے

ابھی نہ ہوگا زمانے میں ظلمتوں کا ظہور
ابھی تو روشنی میرے لہو میں باقی ہے

تمہارے جام ہیں خالی مگر شرابِ سخن
ہنوز تھوڑی سی میرے سبو میں باقی ہے

اک اور ظلم کے لشکر کو زیر ہونا ہے
اک اور جنگ کمان وگلو میں باقی ہے

اسی لیے تو یہ ویرانیاں مہکتی ہیں
کوئی غزال ابھی دشتِ ہُو میں باقی ہے

تھما نہیں ہے مرے زخم کا لہو اب تک
ابھی تو کام بہت سا رفو میں باقی ہے

نہ تیرے ہاتھ میں دوں گا میں اپنا ہاتھ کبھی
کہ اب بھی کج کلہی میری خو میں باقی ہے

○

اظہارِ حرفِ عشق میں عجلت نہ کر سکے
شائستۂ کلام تھے سبقت نہ کر سکے

کل شیخ ترکِ مے کا سبق دینے آئے تھے
رندوں کو مست دیکھ کے ہمت نہ کر سکے

لے آتے اس کے در سے بڑی دولتیں مگر
ہم سے فقیر اُس کی اطاعت نہ کر سکے

مشکل بہت تھا اپنی زمینوں کو چھوڑنا
سو شہرِ خوں سے ہم کبھی ہجرت نہ کر سکے

جن کو قناعتوں کے سبق یاد تھے بہت
وہ اپنے بوریے پہ قناعت نہ کر سکے

بڑھنا تھا میرے دل کی طرف اُن کو دو قدم
لیکن جناب اتنی بھی زحمت نہ کر سکے

چپ سب ستم رسیدہ رہے پیشِ داد گر
لب بستہ لوگ کوئی شکایت نہ کر سکے

چڑھ کر ستونِ حق پہ جو کرتے تھے سر بلند
جب ظلم سر چڑھا تو بغاوت نہ کر سکے

کچھ تو کمی وہاں کی نوازش میں تھی جو ہم
اس کے مکانِ دل میں سکونت نہ کر سکے

مشکل تھا اس کے ساتھ بہت عشق کا سفر
دو گام بھی ہم اس کی رفاقت نہ کر سکے

دنیا وہ دشتِ دوں ہے کہ اس کی زمین پر
جو خوش قدم تھے وہ بھی مسافت نہ کر سکے

کارِ جہاں میں عشق کی مہلت نہ مل سکی
ہم. چاہ کر بھی اس سے محبت نہ کر سکے

○

ہمیشہ کسی امتحاں میں رہا
رہا بھی تو کیا اس جہاں میں رہا

یہ خانہ ہمیشہ سے ویران ہے
کہیں کوئی دل کے مکاں میں رہا!

نہ میں دور تک ساتھ اس کے گیا
نہ وہ دیر تک ہمرہاں میں رہا

وہ دریا پہ مجھ کو بلاتا رہا
مگر میں صفِ تشنگاں میں رہا

میں بجھنے لگا تو بہت دیر تک
اجالا چراغِ زیاں میں رہا

قفس یاد آیا پرندے کو پھر
بہت روز جب آشیاں میں رہا

رہی دیر تک موت سے گفتگو
میں جب حلقۂ رفتگاں میں رہا

○

تن کہیں دیکھا گیا اور سر کہیں دیکھا گیا
تیرے شہرِ خوں کا یہ منظر کہیں دیکھا گیا

دے رہا ہو خود امیرِ شہر شعلوں کو ہوا
جل رہا ہو خود اُسی کا گھر، کہیں دیکھا گیا

بس اُسی پر ختم تھی یہ عشق کی دیوانگی
جو لگا مجنوں کو وہ پتھر کہیں دیکھا گیا

رم جو کرنا ہے مجھے تو اور جاؤں گا کہاں
کوئی وحشی دشت سے باہر کہیں دیکھا گیا

کام ہم تکیہ نشینوں کو شہنشاہی سے کیا
تاج اہلِ فقر کے سر پر کہیں دیکھا گیا

وہ تو بس رکھنا تھا میری مشک کو محرومِ آب
ورنہ دریا پر کوئی لشکر کہیں دیکھا گیا

وہ ہنسا تو سو چراغوں کی لویں روشن ہوئیں
یوں لبِ خنداں کو جلوہ گر کہیں دیکھا گیا

کل نکلتے تھے زبانِ شیخ سے شعلے بہت
ورنہ یوں جلتا ہوا منبر کہیں دیکھا گیا

ہے ازل سے آفتابِ اوج کا شیوہ انیسؔ
دیر تک ٹھہرا کہیں دم بھر کہیں دیکھا گیا

○

بس ایک شام خانۂ دل میں قیام کو
آؤ، کہ چاہیے یہی نسبت غلام کو

کب خود سے دوڑنے کی اجازت ہے دشت میں
تھامے ہے کوئی اور ہماری لگام کو

تیرے بدن کی نہر سے اس تیز دھوپ میں
یک کوزہ آب چاہیے مجھ تشنہ کام کو

مشکل تھا یوں گزارنا اس رات کا سو ہم
دل کے ورق پہ لکھتے رہے تیرے نام کو

چمکے گا اس کی یاد کا مہتاب رات بھر
ہونے دو ہو رہا ہے اندھیرا جو شام کو

روشن اُسی مقام پہ ہوتا ہے کوئی روز
سورج نے چن لیا ہے اُسی ایک بام کو

کچھ خلعت و خطاب کے طالب نہیں کہ ہم
آئے ہیں بس حضور کے در پر سلام کو

○

اتنا آگے نکل آیا سحر و شام سے میں
اب نظر آتا نہیں دیدۂ ایام سے میں

دل ہٹا بیچ سے دونوں کے تو اچھا ہی ہوا
اُدھر آرام سے تو ہے اِدھر آرام سے میں

کبھی 'صحرائی' غزالوں نے کہا تھا مجھ کو
شہر میں ہوگیا مشہور اسی نام سے میں

مجھ کو منظور نہ تھا شہ کا مصاحب رہنا
گرچہ محروم رہا خلعت و انعام سے میں

کام لیتے ہیں جو منبر سے جنابِ واعظ
کام لیتا ہوں وہی اپنے مے و جام سے میں

خوب گزری ہے مری تیرے مکانِ دل میں
خوب واقف ہوں ترے صحن و در و بام سے میں

اس لیے کرتا ہوں اُس شوخ سے بوسے کی طلب
تا نہ محروم رہوں لذتِ دشنام سے میں

ذکر مجنوں کا نہ کر نام نہ فرہاد کا لے
خوب آگاہ ہوں اس عشق کے انجام سے میں

سب نے جس راہ پہ رکھا، نہ رکھا اس پہ قدم
ہٹ کے چلتا ہوں ہمیشہ روشِ عام سے میں

استادِ محترم پروفیسر شبیہ الحسن
کی یاد میں

روشن ہو جن سے رات وہ منظر کہاں سے لائیں
ہم اے فلک ترے مہ و اختر کہاں سے لائیں

منبر کا ہر خطیب سے بڑھتا نہیں وقار
تجھ سا علوِ پایۂ منبر کہاں سے لائیں

خورشید اس جہاں میں چمکتے ہیں چار سو
تجھ سا مگر وہ نور کا پیکر کہاں سے لائیں

جس نے ہمارے قلب میں روشن کیے علوم
بول اے فلک وہ مہرِ منور کہاں سے لائیں

یہ پوچھتے ہیں شہر سے اب تشنگانِ علم
سیراب جس سے ہوں وہ سمندر کہاں سے لائیں

ہم تیرے آسمان میں اے حرفِ اعتبار
اڑنا تو چاہتے ہیں مگر پَر کہاں سے لائیں

خوشبو سے جس کی مہکا ہوا تھا مرا شجر
صحنِ چمن میں اب وہ گلِ تر کہاں سے لائیں

جوہر بغیر قیمتِ آئینہ کچھ نہیں
آئینہ لے بھی آئیں تو جوہر کہاں سے لائیں

کتنا طویل دشت ہے اور کتنی تیز دھوپ
سایہ کرے جو سر پہ وہ چادر کہاں سے لائیں

لے کر وہ اپنے ساتھ خزانے چلا گیا
لعل و زمرد و زر و گوہر کہاں سے لائیں

○

رخ کسی اور کی جانب ہے اشارے کچھ اور
شہر میں چاہنے والے ہیں تمہارے کچھ اور

اتنی جلدی نہیں اس رات میں آتا ہے قرار
دل سے کہہ دو کہ شب ہجر گزارے کچھ اور

ساتھ رہتا ہے بہت روز کوئی عشق میں کب
ہیں جو کچھ اور تمہارے تو ہمارے کچھ اور

ہوگئیں یاد تری آیتیں کچھ اور ہمیں
پڑھ لیے ہم نے ترے عشق کے پارے کچھ اور

میں تو سمجھا تھا کہ اب رات ہے جانے والی
آخرِ شب نکل آئے ہیں ستارے کچھ اور

ایک آواز پہ دیوانے کہاں لوٹے ہیں
میرے آہو سے کہو مجھ کو پکارے کچھ اور

ختم ہوتا ہی نہیں سلسلۂ تشنہ لبی
لوگ موجود ہیں دریا کے کنارے کچھ اور

آج کی رات وہ بیٹھا ہے مرے پہلو میں
آج کی رات فلک چاند اتارے کچھ اور

اتنا آساں نہیں زنجیر بنانا اس کا
پیچ وہ اور دے، گیسو کو سنوارے کچھ اور

پھر ترا ملک رہے گا نہ ترا تاج نہ تخت
بڑھ گئے شہر میں گر ظلم کے مارے کچھ اور

دے مرے ہاتھ میں اب اپنی محبت کا عصا
عمر کا طے ہو سفر اس کے سہارے کچھ اور

شہر میں خوش تنوں خوش پیرہنوں کی خاطر
عشق میں پھر سے اٹھالوں گا خسارے کچھ اور

○

معرکہ جب چھڑ گیا تو کیا ہوا ہم سے سنو
کشتگانِ شہرِ خوں کا ماجرا ہم سے سنو

کیوں شجر سوکھے ہیں کیوں آتے نہیں برگ وثمر
موسموں نے اس چمن میں کیا کیا ہم سے سنو

پردۂ صد رنگِ حیرت خانۂ نیرنگ میں
کون ہے آئینہ اندر آئینہ ہم سے سنو

طاق ودر میں کیوں چراغوں کی لویں خاموش ہیں
کیا ہوا وہ روشنی کا سلسلہ ہم سے سنو

اور یہ چشمِ تماشا بند ہوجاتی ہے جب
پردۂ دل پر نظر آتا ہے کیا، ہم سے سنو

کیوں نہیں ہوتے مناجاتوں کے معنی منکشف
رمز بن جاتا ہے کیوں حرفِ دعا ہم سے سنو

○

جاؤں گا نہ اب چھوڑ کے تجھ کو میں کہیں جان
رہنا ہے مجھے تیرے ہی پہلو میں یقیں جان

دونوں کے جمالوں میں ہے دنیا کا نظارہ
خود کو بھی حسیں جان خدا کو بھی حسیں جان

اک نقش یہاں بھی تری وحشت کا ہے موجود
تو شہر کی مٹی کو بھی صحرا کی زمیں جان

وہ دل میں ہے موجود تو اس خانۂ دل کو
رعنائی و زیبائی میں فردوسِ بریں جان

میں اُس کے لیے اور کہوں اس کے سوا کیا
تو اُس کو مرے دل کی انگوٹھی کا نگیں جان

ہے دل کی حکومت سے بڑی کوئی حکومت
میں تکیہ نشیں ہوں پہ مجھے تخت نشیں جان

یہ صبر فروشوں کی جو ہے بھیڑ، اسی میں
جو شکر سے روشن ہے اسے میری جبیں جان

ان میں سے جفا جو بھی وفا کش بھی بہت ہیں
اس شہر کے معشوقوں کو مت دل کے قریں جان

○

یہ اشعار ماریشس کی خاموش اور خوبصورت
فضاؤں میں سمندر کے کنارے کہے گئے

دور تک کیا عجیب منظر ہے
جس طرف دیکھیے سمندر ہے

روشنی میں نہارہے ہیں شجر
منظروں کی قبا منوّر ہے

دور تک خوشبوؤں کی بستی ہے
دور تک یہ فضا معطّر ہے

صبح کو عارضِ کنارۂ آب
بوسۂ موج سے منوّر ہے

شام کو سایۂ درختاں میں
تند موجوں کا نرم بستر ہے ۔

آسماں پیرہن ستاروں کا
ریت پر چاندنی کی چادر ہے

ساحلوں پر ہجوم پریوں کا
فرسِ موجِ دل ہوا پر ہے

کشتیِ گل میں سیرِ آبِ رواں
دیدۂ دل محیطِ منظر ہے

پھرتہِ آب ڈھونڈتے ہیں صدف
پھر ہمیں جستجوئے گوہر ہے

گھر میں روشن خموشیوں کے چراغ
اور موجوں کا شور باہر ہے

کھل رہی ہے قبائے قطرۂ آب
بحر ہے یا کوئی گلِ تر ہے

حسن ہی حسن ہر طرف ہے یہاں
یہ جزیرہ بہشت منظر ہے

دور پانی میں ڈوبتا سورج
فرشِ دریا پہ سرخ چادر ہے

وقت ڈالے ہوئے ہے پردۂ شام
شور کرتا ہوا سمندر ہے

میں اکیلا کھڑا ہوں ساحل پر
ایک طوفان میرے اندر ہے

ہٹ رہی ہے نگاہ منظر سے
کوئی چہرہ کہیں منور ہے

دل کسی اور کی تلاش میں ہے
کوئی سایہ مرے برابر ہے

آ رہی ہے اُسی غزال کی یاد
دل میں روشن اسی کا پیکر ہے

○

دیوار و در گرے تو پریشان کب ہوا
ڈھا کر مکانِ دل وہ پشیمان کب ہوا

آرائشِ جمال سے جن کو نہ تھا فراغ
آئینہ اُن کو دیکھ کے حیران کب ہوا

سنتا ہوں تو نے ترکِ تعلق کیا ہے پھر
اب کے یہ کس کے ساتھ مری جان کب ہوا

عمامہ سر پہ رکھ تو لیا شیخ نے مگر
صورت بدل کے صاحبِ ایمان کب ہوا

رکھے ہوئے ہے سر پہ وہ اب بھی لہو کا تاج
حیوان میرے شہر کا انسان کب ہوا

مجھ کو نہیں، یہ دشت کی وسعت کو یاد ہے
وحشت میں چاک میرا گریبان کب ہوا

حاکم کہیں کا ہو وہ کہیں کا ہو بادشاہ
لیکن دلوں کے ملک کا سلطان کب ہوا

میں تو گیا تھا چھوڑ کر اس کو بسا ہوا
کچھ تو بتا کہ شہر بیابان کب ہوا

رہنے لگا ہے اس میں کوئی اور خوش جمال
تیرے بغیر دل مرا ویران کب ہوا

یاد آئے خود مجھے تو کسی کو بتاؤں میں
اپنے ہی گھر میں بے سر و سامان کب ہوا

زخموں کے پھول کھل تو رہے تھے یہاں مگر
یہ دل، خبر نہیں کہ گلستان کب ہوا

زنجیر ہم کو لے کے اندھیرے میں آئی تھی
روشن ہمارے نور سے زندان کب ہوا

کہتے ہیں لوگ ہم سے کہ زندہ نہیں ہیں ہم
جاری ہماری موت کا فرمان کب ہوا

○

سب شمشیر بکف تھے لیکن ہمت کرتا کون
میرے قتل کی اس لشکر میں جرأت کرتا کون

آئینے کے سامنے سب تھے آنکھوں سے محروم
آئینے کی نیرنگی پر حیرت کرتا کون

میداں میں اب کون نکلتا ناصر تھے خاموش
وہ آواز تو دیتا لیکن نصرت کرتا کون

گرم ہوا تھی، صحراؤں میں آگ برستی تھی
اس موسم میں اپنے شہر سے ہجرت کرتا کون

تیغ اٹھانے والے تیری طاقت تھی معلوم
سر دینے والوں میں تجھ سے بیعت کرتا کون

تنگ زمیں تھی صحرا کی اور جنگل تھے آباد
تیرے ہجر کی ساعت میں اب وحشت کرتا کون

جب میں سفر پر نکلا تھا تو کوئی نہ تھا موجود
دروازے پر آ کر مجھ کو رخصت کرتا کون

چار طرف تھا دستِ خزاں کی تاراجی کا رقص
شاخِ شجر پر غنچہ و گل کی حسرت کرتا کون

○

سرخرو حرف سے یہ تازہ خیالی ہوئی ہے
مسندِ شعر پہ جب میری بحالی ہوئی ہے

سر اٹھا کر یہ جو چلتے ہیں یہاں کج کلہاں
طرح اس شہر میں یہ میری ہی ڈالی ہوئی ہے

پر یہاں خوب پرندوں کے جلائے گئے ہیں
یہ فضا شہر میں یوں ہی نہیں کالی ہوئی ہے

اس کے کشکول میں سب شکر کی دولت رکھ دی
مجھ سے دنیائے دنی جب بھی سوالی ہوئی ہے

جب سے رم کرنے لگے ہیں تری یادوں کے غزال
یہ مرے دل کی زمیں تب سے غزالی ہوئی ہے

کیا کوئی دینے لگا ہے کہیں شعلوں کو ہوا
کس لیے شاخِ چمن چڑیوں سے خالی ہوئی ہے

کام آتی ہے پرندوں کی اسیری کے لیے
حق میں صیّاد کے یہ بے پَر و بالی ہوئی ہے

تو حسیں ہے تو کوئی اور بھی ہے تجھ سے حسیں
کب کوئی ڈھالی ہوئی شکل مثالی ہوئی ہے

خلق ہوتے ہیں نئے شعر نئی آب کے ساتھ
کب زرِ حرف سے جھولی مری خالی ہوئی ہے

اس غزل کی یہ زمیں، کچھ مجھے معلوم نہیں
ہے کسی اور کی یا میری نکالی ہوئی ہے

آج ہو آئیں گے اُس کوچۂ جاناں میں انیسؔ
بات یہ ہم نے کئی روز سے ٹالی ہوئی ہے

○

قائم چاند پوری کی زمین میں

طاق، روزن، سائباں، دیوار و در بھیگے ہوئے
آسماں سارا سمندر گھر کے گھر بھیگے ہوئے

وہ تمازت ہے فضا سیّال سیلِ آب ہے
خشک موسم میں بھی ہیں سارے شجر بھیگے ہوئے

موسمِ باراں میں جائیں گے پرندے کس طرف
تیز طوفانی ہوا اور بال و پر بھیگے ہوئے

سبزۂ صحرا پہ شبنم دوڑتی پھرتی رہی
تھا دماغِ رم کسے تھے دشت گر بھیگے ہوئے

تیز تر ہے شاخ اندر شاخ رقصِ آبِ زر
نقرئی بارش میں ہیں برگ و ثمر بھیگے ہوئے

پیش منظر میں سبھی صحرا نظر آتے ہیں خشک
اور پس منظر میں تاحدِ نظر بھیگے ہوئے

○

یہ جو سورج ہے یہ جب شام کو ڈھل جاتا ہے
جو چمکتا ہوا منظر ہے بدل جاتا ہے

کوئی غم خانۂ دنیا میں ٹھہرتا ہی نہیں
آج جو پاؤں یہاں دھرتا ہے کل جاتا ہے

بجھنے لگتی ہے دمکتے ہوئے مہتاب کی لو
جب چراغِ رخِ روشن ترا جل جاتا ہے

یوں تو سب چلتے ہیں منزل کی طرف ساتھ مگر
جو ٹھہرتا نہیں وہ آگے نکل جاتا ہے

عشق جیسا کوئی رشتہ نہیں تجھ سے لیکن
تو جو آ جاتا ہے دل میرا بہل جاتا ہے

روز تلوار لٹکتی ہے مری گردن پر
روز خطرہ مرے مرجانے کا ٹل جاتا ہے

سب ہیں ظالم کی کمانوں کے نشانے پہ مگر
ہے جو شائستۂ ناوک وہ سنبھل جاتا ہے

شعر میں شور نہ مصرعے میں تلاطم ہے انیسؔ
کچھ تو کر ورنہ یہ اسلوبِ غزل جاتا ہے

○

وہ ستمگر جو کہیں میرا مسیحا ہو جائے
دل پہ جو زخم لگا ہے ابھی اچھا ہو جائے

آج تو خیر بہت خیر سے گزری ہے مگر
کون جانے کہ مرے شہر میں کل کیا ہو جائے

شام سے پہلے کئی بار چھپا ہے سورج
شام سے پہلے کہیں پھر نہ اندھیرا ہو جائے

میری آنکھوں میں ہے اشکوں کا وہ سیلاب کہ میں
رونے بیٹھوں تو یہ صحرا ابھی دریا ہو جائے

تختِ شاہی نہ زر و مال نہ جاگیر و علم
بس ہمیں چاہیے اتنا کہ گزارا ہوجائے

وہ زمیں جس میں نہیں ایک زمانے سے نمی
کیا خبر کوئی شجر اس میں بھی پیدا ہوجائے

پھر مرا سر ہو قلم پھر ہو ترے ہاتھ میں تیغ
معرکہ پھر سرِ میداں وہی برپا ہوجائے

کوچۂ عشق کا وہ در جو کسی پر نہ کھلا
میں جو آواز لگاؤں تو ابھی وا ہوجائے

○

راہ بینی میں بے یقیں نکلے
تھا نکلنا کہیں، کہیں نکلے

پردۂ شب میں جن کے چہرے تھے
پو پھٹی جب تو کیا حسیں نکلے

تھے جو سائے کی طرح ساتھ مرے
یار وہ مارِ آستیں نکلے

وقت نے ڈال دی تھی ان پر خاک
لعل کیا کیا تہہِ زمیں نکلے

سامنے پتھروں کے آ آ کر
دیکھ ہم کیسے خوش جبیں نکلے

کتنے ارماں تھے جو ہوئے پورے
کتنے ارماں تھے جو نہیں نکلے

کیسے رکھتے چھپا کے اپنے پھول
یار سب میرے خوشہ چیں نکلے

جب بھی ملنے انیسؔ سے پہنچے
گھر سے وہ خستہ و حزیں نکلے

○

آگے یہ گریباں نہ کبھی چاک کروں گا
وحشت سے ترے دشت کو اب پاک کروں گا

جس دن بھی ہوا تیز مرا شعلۂ ظلمت
اس دن ورقِ مہر تجھے خاک کروں گا

شب اس کے لیے مسندِ مہتاب بچھا کر
تاروں کا تماشا تہہِ افلاک کروں گا

اس کو بھی بناؤں گا خوش آموزِ تلاطم
اور خود کو بھی خار و خس و خاشاک کروں گا

دیکھوں گا ابھی اور بھی خنجر کی روانی
قاتل کو ابھی اور بھی سفّاک کروں گا

بل کھاتے ہوئے جسم پہ اک زخم لگا کر
اس مارِ محبت کو غضبناک کروں گا

دوڑائے گا وہ آہوئے چالاک کہاں تک
اک دن تو اسے بستۂ فتراک کروں گا

پہلے تو کروں گا میں تری آتشِ خوں تیز
پھر فرشِ بدن پر تجھے بیباک کروں گا

○

یہیں میں رہوں گا رہوں گا یہیں
یہ میری زمیں ہے یہ میری زمیں

نہ ہوگی طلب منصب و جاہ کی
نہ آگے کسی کے جھکے گی جبیں

رہے گی نہ باقی تری سلطنت
نہ دائم رہے گا تو مسند نشیں

چلا تو ہے میرے ہی گھر کی طرف
نکل جائے گا وہ کہیں کا کہیں

جو دل کی کہانی ہے کہہ ڈال تو
یقیں اس کو آئے، نہ آئے یقیں

عدو پھر سے آمادۂ جنگ ہے
نکل گھر سے تو بھی، پلٹ آستیں

طلب اس سے بوسہ کروں گا ضرور
وہ مانا تو مانا نہیں تو نہیں

کہیں بھی لگا دل نہ گھر کے سوا
بہت میں نے گھومے خراسان وچیں

ہم آزادگانِ جہاں کے لیے
نہیں کوئی بندش چہ دنیا چہ دیں

میں اس شہر میں کس سے جا کر ملوں
مکانوں سے غائب ہیں سارے مکیں

ہمیشہ بلندی پہ رہتا ہے وہ
ستارے کی دنیا سپہر بریں

میں منزل پہ اپنی پہنچ بھی گیا
مرے ہمسفر ہیں وہیں کے وہیں

○

آئی آنکھوں میں تو آنکھوں کو ستارہ کر گئی
اس کی صورت ظلمتِ شب میں اُجالا کر گئی

داستانوں کی زباں تھے برگہائے خشک و تر
اور یہ ظالم ہوا پیڑوں کو ننگا کر گئی

منظروں کی حیرتوں کو دیکھنے کے شوق میں
آنکھ اس درجہ کھلی میری کہ اندھا کر گئی

ہر طرف اس شہر میں سب کے گریباں چاک ہیں
اس کی خوش روئی عجب اب کے تماشا کر گئی

ایک نامعلوم خواہش ذہن و دل کے درمیاں
سانپ کی مانند اُبھری جسم نیلا کر گئی

اک کرن خورشید کی اُتری شفق کے بام سے
اُس کے یاقوتی لبوں کو آ کے سجدہ کر گئی

اک ہوا ایسی بھی آئی جو زمینِ عشق پر
دل کے سب بکھرے ہوئے اوراق یکجا کر گئی

پھر مکانِ دل کے ہر گوشے میں ہنگامہ ہوا
پھر مکینوں کو تمہاری یاد دہلا کر گئی

○

جو کبھی کرنا نہ تھا وہ کام کر جانا پڑا
عشق میں تیرے ہمیں جاں سے گزر جانا پڑا

کون سے آسیب نے خالی کیے سارے مکاں
کیا ہوا جو شہر سب کو چھوڑ کر جانا پڑا

اس سے کم کیا حسن کی سرکار میں ہوتا قبول
لے کے اس کے سامنے سوغاتِ سر جانا پڑا

شہر کی سڑکوں پہ آوارہ پھرے دن بھر مگر
شام جب ہونے لگی تو ہم کو گھر جانا پڑا

بڑھ رہی تھی آگ اس کے جسم کی میری طرف
سو مجھے خواہش کے دریا میں اتر جانا پڑا

تھا مکانِ یار میں کیسا طلسمِ رنگ و بو
باخبر آئے تھے ہم اور بے خبر جانا پڑا

میں بہت آگے نکل آیا تھا لیکن راہ میں
لوگ پیچھے رہ گئے تھے سو ٹھہر جانا پڑا

کٹ رہے تھے اس کے آگے سب ہنر والوں کے ہاتھ
پیشِ سلطاں چھوڑ کر دستِ ہنر جانا پڑا

روشنی کے منظروں سے ربط رکھنے کے لیے
اس مکانِ ماہ میں شام و سحر جانا پڑا

زندہ رہنے کا پھر اس کے بعد کچھ حاصل نہ تھا
اس نے کچھ ایسے ہمیں دیکھا کہ مر جانا پڑا

معرکوں میں ایک ایسا وقت بھی آیا انیسؔ
جنگ کے میداں میں بے تیغ و سپر جانا پڑا

○

میں خود کو اک نئی دنیا دکھانے والا ہوں
سوئے ستارۂ و مہتاب جانے والا ہوں

کوئی فرشتہ مرے گھر میں آنے والا ہے
میں فرشِ راہ پہ آنکھیں بچھانے والا ہوں

کھڑا ہوں در پہ ترے دولتِ زیاں لے کر
نکل کے دیکھ، خزانے لٹانے والا ہوں

تری بھی آنکھ میں دیکھوں گا جوئے اشک رواں
تجھے بھی شہر کا نوحہ سنانے والا ہوں

اگر تو ٹالنے والا ہے اپنے وعدے کو
تو وعدہ کر کے بھلا میں کب آنے والا ہوں

لہو میں ڈوبنے والے ہیں بام و در میرے
میں تیغ و سر کی روایت بچانے والا ہوں

کروں گا خشک زمیں کو شگفتہ و شاداب
قریبِ خیمۂ گل نہر لانے والا ہوں

○

کون کہتا ہے کہ تیری چشمِ حیرانی میں ہے
وسعتِ صحرا تو میری چاک دامانی میں ہے

تو نہیں ملتا نہ مل اس کا نہیں شکوہ مجھے
جو خرابی ہے وہ تیری زود پیمانی میں ہے

ساری جاگیریں یہیں سے بانٹتا رہتا ہوں میں
بادشاہی کا مزہ تو دل کی سلطانی میں ہے

ہے جو پروانہ تو شب بھر شعلۂ روشن میں رہ
زندگی تیری اسی شمعِ شبستانی میں ہے

آنکھ کیا

حرف جو

بیٹھ جا

میرا

ذکر اس

موج

لطف جو

رنگِ چمن

○

جو کبھی کرنا نہ تھا وہ کام کر جانا پڑا
عشق میں تیرے ہمیں جاں سے گزر جانا پڑا

کون سے آسیب نے خالی کیے سارے مکاں
کیا ہوا جو شہر سب کو چھوڑ کر جانا پڑا

اس سے کم کیا حسن کی سرکار میں ہوتا قبول
لے کے اس کے سامنے سوغاتِ سر جانا پڑا

شہر کی سڑکوں پہ آوارہ پھرے دن بھر مگر
شام جب ہونے لگی تو ہم کو گھر جانا پڑا

بڑھ رہی تھی آگ اس کے جسم کی میری طرف
سو مجھے خواہش کے دریا میں اتر جانا پڑا

تھا مکانِ یار میں کیسا طلسمِ رنگ و بو
باخبر آئے تھے ہم اور بے خبر جانا پڑا

میں بہت آگے نکل آیا تھا لیکن راہ میں
لوگ پیچھے رہ گئے تھے سو ٹھہر جانا پڑا

کٹ رہے تھے اس کے آگے سب ہنر والوں کے ہاتھ
پیشِ سلطاں چھوڑ کر دستِ ہنر جانا پڑا

روشنی کے منظروں سے ربط رکھنے کے لیے
اس مکانِ ماہ میں شام و سحر جانا پڑا

زندہ رہنے کا پھر اس کے بعد کچھ حاصل نہ تھا
اس نے کچھ ایسے ہمیں دیکھا کہ مر جانا پڑا

معرکوں میں ایک ایسا وقت بھی آیا انیسؔ
جنگ کے میداں میں بے تیغ و سپر جانا پڑا

○

میں خود کو اک نئی دنیا دکھانے والا ہوں
سوئے ستارہ و مہتاب جانے والا ہوں

کوئی فرشتہ مرے گھر میں آنے والا ہے
میں فرشِ راہ پہ آنکھیں بچھانے والا ہوں

کھڑا ہوں در پہ ترے دولتِ زیاں لے کر
نکل کے دیکھ، خزانے لٹانے والا ہوں

تری بھی آنکھ میں دیکھوں گا جوئے اشک رواں
تجھے بھی شہر کا نوحہ سنانے والا ہوں

اگر تو ٹالنے والا ہے اپنے وعدے کو
تو وعدہ کر کے بھلا میں کب آنے والا ہوں

لہو میں ڈوبنے والے ہیں بام و در میرے
میں تیغ و سر کی روایت بچانے والا ہوں

کروں گا خشک زمیں کو شگفتہ و شاداب
قریب خیمۂ گل نہر لانے والا ہوں

○

کون کہتا ہے کہ تیری چشمِ حیرانی میں ہے
وسعتِ صحرا تو میری چاک دامانی میں ہے

تو نہیں ملتا نہ مل اس کا نہیں شکوہ مجھے
جو خرابی ہے وہ تیری زود پیمانی میں ہے

ساری جاگیریں یہیں سے بانٹتا رہتا ہوں میں
بادشاہی کا مزہ تو دل کی سلطانی میں ہے

ہے جو پروانہ تو شب بھر شعلۂ روشن میں رہ
زندگی تیری اسی شمعِ شبستانی میں ہے

آنکھ کیا سیکھے گی اس کے سامنے آئے بغیر
حرفِ حیرت کا سبق تو آئینہ خوانی میں ہے

بیٹھ جانے دے اسے تو میں نظر آؤں تجھے
میرا پیکر بھی اسی گردِ بیابانی میں ہے

ذکر بس میرا حکایت نامۂ وحشت میں ہے
موج بس میری یمِ صحرا کی طغیانی میں ہے

لطف جو پیرایۂ گنگ و جمن میں ہے انیسؔ
رنگِ چیں میں ہے نہ وہ سبکِ خراسانی میں ہے

○

پوچھ مت میرا لہو صرفِ سناں کتنا ہوا
دیکھ یہ آ کر کہ ظالم کا زیاں کتنا ہوا

خوفِ جاں تھی اس کی تیغِ چشم کی تیزی مگر
کھالیا جب زخم تو آرامِ جاں کتنا ہوا

ہو رہی ہیں آسماں میں ان کی پروازیں بہت
ان پرندوں سے مگر طے آسماں کتنا ہوا

ہر طرف گہری سیاہی ہے محیطِ عشق میں
ایک شمعِ دل کے بجھنے سے دھواں کتنا ہوا

وہ جو مجلس تھی الم پاروں کے پڑھنے کی، وہاں
کچھ بتا مجھ کو مرا قصہ بیاں کتنا ہوا

کر دیا میرے لیے فرشِ بدن آراستہ
رات ہوتے ہی وہ مجھ پر مہرباں کتنا ہوا

میں نے تو اس کے لیے آنکھیں بچھائی تھیں مگر
پُرتپاکی سے وہ میری بدگماں کتنا ہوا

یاد کرنے کی ہمیں مہلت ملے تو ہم بتائیں
ظلم تیری مملکت میں کب کہاں کتنا ہوا

○

یہ دیدۂ بے آب کبھی تر نہ رہے گا
آنکھوں کے صدف میں کوئی گوہر نہ رہے گا

روشن ہے بہت رات، چمکتا ہے بہت چاند
لیکن مری آنکھوں میں یہ منظر نہ رہے گا

جس دن میں ترے عشق میں دیوانہ بنوں گا
اس شہر میں اس دن کوئی پتھر نہ رہے گا

دیوار و در و بام تو موجود رہیں گے
نکلا تھا جسے چھوڑ کے وہ گھر نہ رہے گا

وہ پیاس ہے میری کہ بجھائے نہ بجھے گی
پینے پہ جو آؤں تو سمندر نہ رہے گا

آ جا کہ مرے دل کی زمیں ہے ابھی گلزار
کچھ دیر میں پھولوں کا یہ بستر نہ رہے گا

بہتا ہے کہیں خون برستی ہے کہیں آگ
اب کوئی مرے شہر میں آ کر نہ رہے گا

آئے گا وہ خورشید تو کچھ روشنی ہوگی
یہ خانۂ دل یوں تو منوّر نہ رہے گا

اس دن تجھے یاد آئے گا وہ سبز گھنا پیڑ
جس دن کوئی سایہ ترے سر پر نہ رہے گا

○

ہنر کے سب خزانوں تک رسائی ملنے والی ہے
مجھے ملکِ سخن کی پادشائی ملنے والی ہے

ہیں نالاں گریۂ زنجیر سے زنداں کی دیواریں
سنا ہے اب اسیروں کو رہائی ملنے والی ہے

کیا ہے اپنی خدمت میں طلب صاحب جمالوں نے
جہانِ حسن کی مجھ کو خدائی ملنے والی ہے

جنابِ شیخ سے کہہ دو کہ میخانے میں کل آئیں
مجھے رندوں سے مہرِ پارسائی ملنے والی ہے

محبت سے بھرا کشکول کل وہ دینے والا ہے
فقیرِ دل کو شاہانہ گدائی ملنے والی ہے

جو کل تک روز لکھتا تھا مجھے پرچے محبت کے
اسی سے آج تحریرِ جدائی ملنے والی ہے

بہت آرام سے کٹ جائیں گی میری خنک راتیں
مجھے اس مخملیں تن کی رضائی ملنے والی ہے

سنا ہے باغ میں خوش رنگ موسم آنے والا ہے
پرندوں کو دوبارہ خوش نوائی ملنے والی ہے

جنہیں ملتا نہیں ہے راستہ خود اپنی منزل کا
انہیں کو قافلوں کی رہنمائی ملنے والی ہے

میں اس کی مدح میں تازہ قصیدہ لکھ کے لایا ہوں
حضورِ شاہ مجھ کو بھی رسائی ملنے والی ہے

○

ہر لفظ کو اسیرِ مہ و سال دیکھ کر
چپ ہے مرا جریدۂ احوال دیکھ کر

اپنے قفس کی تیلیاں کرنے لگا درست
صیاد طائروں کے پر و بال دیکھ کر

بیٹھا ہے جب بساط پہ تو میرے سامنے
ہر چال چل رہا ہوں تری چال دیکھ کر

میں پھنس گیا تو اس میں نظر کی خطا ہے کیا
دانے پہ آ گرا ہوں ترا جال دیکھ کر

کیا کیا نہ اس سفر میں اٹھائی ہیں سختیاں
اگلے سفر پہ جائیں گے ہم فال دیکھ کر

موئے قلم کی داد طلب کر رہا ہوں میں
دل کے ورق پہ داغ کی تمثال دیکھ کر

○

روشنیِ گُل سرِ شاخِ چمن دیکھا کیے
ہم قبائے نور میں اُس کا بدن دیکھا کیے

جامۂ گُل میں نموئے گُل کا منظر دیکھ کر
ہم چمن میں حرفِ گُل کا پیرہن دیکھا کیے

اس نے لب کھولے تو اس کا بولنا اچھا لگا
دیر تک ہم اس کو مصروفِ سخن دیکھا کیے

وہ نظر آتا تھا ہم کو ہر طرف سو ہم اسے
انجمن در انجمن در انجمن دیکھا کیے

جسم اس کا اک جواہر خانۂ صد رنگ تھا
گہ بدخشاں پر نظر تھی گہ یمن دیکھا کیے

آنکھ بھر کر اس غزالِ دشت کو دیکھا نہیں
شہر والے بس مرا دیوانہ پن دیکھا کیے

حرف روشن ہو رہے تھے میرے شعروں میں انیسؔ
میں غزل پڑھتا گیا اہلِ سخن دیکھا کیے

○

نکل کے گرد سے کوئی سوار آتا ہے
اور ایک بار نہیں بار بار آتا ہے

اداس ہوتا ہے دن میں مکینِ عشق اگر
تو رات خانۂ غم میں گزار آتا ہے

کُھلے کُھلے نہ کُھلے تیرے گھر کا دروازہ
مگر یہ دل ہے کہ تجھ کو پکار آتا ہے

خود اپنے سینے پہ میں بڑھ کے روک لیتا ہوں
عدو کی تیغ سے اُس پر جو وار آتا ہے

جو پیچ آیا ہے یہ میری زندگی میں، یہی
تمہاری زلف کو جا کر سنوار آتا ہے

کسی کی آنکھ مجھے دیکھتی ہے کیوں ہر دم
یہ صبح و شام مجھے کیوں خمار آتا ہے

میں اس کی زلف میں الجھا تو ہنس کے وہ بولا
لو میرے دام میں میرا شکار آتا ہے

وہ دل نے کھائے ہیں دھوکے کہ دل کے سودے میں
کسی پہ کم ہی مجھے اعتبار آتا ہے

یہ ہجر و وصل یہ درد و الم یہ سوزِ جگر
دکانِ دل سے یہ سب کچھ ادھار آتا ہے

دہک رہی ہے بہت اس کے دل میں عشق کی آگ
وہ روز میری طرف بیقرار آتا ہے

سفر کے بحر سے وہ پھول بنتا جاتا ہے
ہمارے پاؤں کے نیچے جو خار آتا ہے

کچھ اور صاف ترا عکس ہونے لگتا ہے
کبھی جو شیشۂ دل پر غبار آتا ہے

وہ روز لے کے نکلتا ہے تیغ ابرو کی
جدھر بھی جاتا ہے لوگوں کو مار آتا ہے

○

کپکپی رہتی ہے جنگل کی فضا میں رات بھر
چیختا ہوں میں نیستانِ بلا میں رات بھر

سحر کوئی میرے حرفِ مدّعا میں ہے ضرور
کیوں برستے ہیں گہر صحنِ دعا میں رات بھر

میں اُدھر صحرائے بے منظر کی تاریکی میں تھا
تو اِدھر روشن رہا دشتِ ضیا میں رات بھر

نور میں ڈوبی ہوئی ہے میری دنیائے سخن
لفظ روشن ہیں تری حمد و ثنا میں رات بھر

○

شمشیرِ چشم پیشِ ستمگر اٹھا کے دیکھ
تن سے اتارا جائے گا سر، سر اٹھا کے دیکھ

آئیں گے تجھ کو اب کے قفس ہی قفس نظر
صحنِ چمن سے پردۂ منظر اٹھا کے دیکھ

ہیں عاشقوں کے خوں سے ورق سب بھرے ہوئے
تو دلبرانِ شہر کے دفتر اٹھا کے دیکھ

ان پر جما ہوا ہے مری ہی جبیں کا خوں
اس شہر میں پڑے ہوئے پتھر اٹھا کے دیکھ

صیّاد نے کیے ہیں پرندوں پہ کیا ستم
فرشِ چمن سے ٹوٹے ہوئے پر اٹھا کے دیکھ

ایسی کہیں نہ تاب نہ ایسا کہیں جمال
تو میرے طشتِ حرف کا گوہر اٹھا کے دیکھ

گزرا ہے اس طرف سے کوئی رشکِ ماہتاب
کیسی ہوئی ہے خاک منور، اٹھا کے دیکھ

بھاری نہیں ہے شیخ یہ تیرے گناہ سے
گٹھری مرے گناہ کی سر پر اٹھا کے دیکھ

معنی میں حسنِ صوت میں اس کی نہیں مثال
مصرعہ مری غزل کا مکرر اٹھا کے دیکھ

پیشِ کماں یہ سینہ کشادہ کروں کچھ اور
تو اور شورِ خوں مرے اندر اٹھا کے دیکھ

میں بھی شعاعِ نور کا ہوں کب سے منتظر
میری طرف بھی دیدۂ انور اٹھا کے دیکھ

○

پوچھ نہ مجھ سے کیسا ہوں
جیسا بھی ہوں اچھا ہوں

تیری دعا کے سائے میں
گرم زمیں پر بیٹھا ہوں

میری موجیں ساکن ہیں
کہنے کو میں دریا ہوں

تیرے لہو میں شامل ہوں
تیرے بدن میں رہتا ہوں

ایک سفر پر جانا ہے
ایک سفر سے لوٹا ہوں۔

کہیں نہیں جی لگتا ہے
مارا مارا پھرتا ہوں

کوئی نہیں ہے میرے ساتھ
دیکھ میں اب بھی تنہا ہوں

کہیں نہیں ہے میرا گھر
اِدھر اُدھر بس رہتا ہوں

ایک طرف وہ لشکر ہے
ایک طرف میں تنہا ہوں

دل کے زخم چمکتے ہیں
اور میں روشن رہتا ہوں

بول تجھے کیا نذر کروں
لعل و گہر سب لایا ہوں

کھول بھی اب دروازے کو
دیر سے دستک دیتا ہوں

مجھ میں اپنا چہرہ دیکھ
میں تیرا آئینہ ہوں

روز تجھے پا لیتا ہوں
روز تجھے کھو دیتا ہوں

کوچے تو سب روشن ہیں
میں ہی رستہ بھولا ہوں

سب کے سب بیگانے ہیں
کس بستی میں ٹھہرا ہوں

تیری نرم ہتھیلی پر
آنسو بن کر ٹپکا ہوں

اب بھی ترے آئینے سے
گرد ہٹاتا رہتا ہوں

آج بھی میں گل دانوں میں
پھول سجائے بیٹھا ہوں

اُٹھ اب خاک کے بستر سے
تجھ کو لینے آیا ہوں

کھول آنکھیں پہچان مجھے
دیکھ میں تیرا بیٹا ہوں

تیری نرم ہتھیلی پر
آنسو بن کر ٹپکا ہوں

اب بھی ترے آئینے سے
گرد ہٹاتا رہتا ہوں

آج بھی میں گل دانوں میں
پھول سجائے بیٹھا ہوں

اُٹھ اب خاک کے بستر سے
تجھ کو لینے آیا ہوں

کھول آنکھیں پہچان مجھے
دیکھ میں تیرا بیٹا ہوں

بول تجھے کیا نذر کروں
لعل و گہر سب لایا ہوں

کھول بھی اب دروازے کو
دیر سے دستک دیتا ہوں

مجھ میں اپنا چہرہ دیکھ
میں تیرا آئینہ ہوں

روز تجھے پا لیتا ہوں
روز تجھے کھو دیتا ہوں

کوچے تو سب روشن ہیں
میں ہی رستہ بھولا ہوں

سب کے سب بیگانے ہیں
کس بستی میں ٹھہرا ہوں

تیری نرم ہتھیلی پر
آنسو بن کر ٹپکا ہوں

اب بھی ترے آئینے سے
گرد ہٹاتا رہتا ہوں

آج بھی میں گل دانوں میں
پھول سجائے بیٹھا ہوں

اُٹھ اب خاک کے بستر سے
تجھ کو لینے آیا ہوں

کھول آنکھیں پہچان مجھے
دیکھ میں تیرا بیٹا ہوں

بول تجھے کیا نذر کروں
لعل و گہر سب لایا ہوں

کھول بھی اب دروازے کو
دیر سے دستک دیتا ہوں

مجھ میں اپنا چہرہ دیکھ
میں تیرا آئینہ ہوں

روز تجھے پا لیتا ہوں
روز تجھے کھو دیتا ہوں

کوچے تو سب روشن ہیں
میں ہی رستہ بھولا ہوں

سب کے سب بیگانے ہیں
کس بستی میں ٹھہرا ہوں

تیری نرم ہتھیلی پر
آنسو بن کر ٹپکا ہوں

اب بھی ترے آئینے سے
گرد ہٹاتا رہتا ہوں

آج بھی میں گل دانوں میں
پھول سجائے بیٹھا ہوں

اُٹھ اب خاک کے بستر سے
تجھ کو لینے آیا ہوں

کھول آنکھیں پہچان مجھے
دیکھ میں تیرا بیٹا ہوں

○

پہنچے اس شاہ کی خدمت میں گداگر کیا کیا
خم ہوئے خلعت و منصب کے لیے سر کیا کیا

چند سکوں میں خریدے ہوئے یہ سارے قلم
لکھ رہے ہیں تری توصیف میں دفتر کیا کیا

کل مجھے دی ہے ہوا نے ترے آنے کی خبر
کُھلنے والے ہیں مرے دل کی طرف در کیا کیا

میں جنہیں چومتا رہتا تھا انہیں ہاتھوں سے
سینہ و سر کی طرف آئے ہیں پتھر کیا کیا

پھوٹتی رہتی ہیں خوش رنگ شعائیں کتنی
کاسۂ چشم میں رکھتا ہے وہ جوہر کیا کیا

لوچ ہے اس کے بدن کا نہ وہ یاقوت لبی
گرچہ ہیں گرد ہمارے پری پیکر کیا کیا

درد کے نیلم و پکھراج الم کے موتی
دیکھ تو آ کے کبھی ہے مرے اندر کیا کیا

دیکھ کے ان کو میں حیران ہوا جاتا ہوں
ہو گئے لوگ مرے قد کے برابر کیا کیا

آج تک ہو نہ سکا جن کا زمانے میں جواب
لکھنؤ پیدا کیے تو نے سخنور کیا کیا

کتنی شکلوں میں وہ رہتا تھا مرے دل میں انیسؔ
یاد کرتا ہوں اسے نقش بنا کر کیا کیا

○

جب اس کا ذکر مری گفتگو میں رہتا ہے
کوئی چراغ سا روشن لہو میں رہتا ہے

یہ اور کس کی صدا گونجتی ہے صحرا میں
مرے سوا بھی کوئی دشتِ ہُو میں رہتا ہے

مرے حریف سے میرا مکالمہ ہے وہی
جو روزِ جنگ کمان و گلو میں رہتا ہے

یہ روشنی جو اُدھر ہے تو میری صف کا، ضرور
کوئی ستارہ سپاہِ عدو میں رہتا ہے

وہ جس کی آنکھ میں وحشت کا رنگ روشن ہے
وہی غزال مری جستجو میں رہتا ہے

بدن میں جیسے کوئی پھول کھلنے لگتا ہے
عجیب تجربہ کارِ نمو میں رہتا ہے

میں سارے زخم زمانے کے سیتا رہتا ہوں
رواں یہ ہاتھ ہمیشہ رفو میں رہتا ہے

نہاں ہیں جس کی ہر اک موج میں نہنگ انیسؔ
مرا سفینہ اُسی آبجو میں رہتا ہے

○

بات کوئی ہو اسے خوب بنا کر کہنا
شعر جب بھی کوئی کہنا تو سجا کر کہنا

بیستوں اُس کے لیے کاٹ رہا ہوں اب بھی
ہو جہاں بھی، مری شیریں سے یہ جا کر کہنا

تیرے آگے نہ ستارہ ہے نہ سورج نہ قمر
پردہ اس کے رخِ روشن سے ہٹا کر کہنا

آج دیوانہ ہے کل تک ترا عاشق تھا یہی
اس پری وش کو یہ تصویر دکھا کر کہنا

یوں ستمگر نہیں سنتے کبھی حق بات سو تم
جو بھی کہنا ہے وہ شمشیر اٹھا کر ۔ کہنا

پھر کوئی شہر میں اس کا سا دکھائی نہ دیا
وہ یگانہ تھا اسے یاد دلا کر کہنا

داستاں شہر کے سب دل زدگاں کی اس سے
کہنا لیکن مری روداد ہٹا کر کہنا

عشق ہوتا ہے تو ہوتا ہے یہی آخرِ کار
زخم دل پر کوئی کھانا تو نہ آ کر کہنا

تیر چھوڑے گی بہت صبح کمانِ خورشید
وہ جو سوئے ہوئے ہیں ان کو جگا کر کہنا

جو مرا حال ہے وہ حال تو کہنا اس سے
اور کچھ اپنی طرف سے نہ بڑھا کر کہنا

○

کھینچتا ہے جنگ میں شمشیر کیا
اب رہی شمشیر کی توقیر کیا

منہدم کر دے گی تیرے خواب کو
پوچھتا ہے خواب کی تعبیر کیا

میں تو خود ہوں اپنی وحشت کا اسیر
تو مجھے پہنائے گا زنجیر کیا

تیر چھٹتے ہیں کمانوں سے بہت
جو نہ ہو زیبِ گلو وہ تیر کیا

کس لیے جلوؤں میں یہ نیرنگ ہے
آئینے میں ہے تری تصویر کیا

بجھ رہے ہیں لفظ و معنی کے چراغ
روشنی دے گی مری تحریر کیا

○

شمعِ غم ہجر کی راتوں میں جلاتا کیوں ہے
اور جلاتا ہے تو پھر اس کو بجھاتا کیوں ہے

خوں میں ڈوبی ہوئی تصویر کہاں تک دیکھوں
روز تو شہر کی روداد سناتا کیوں ہے

دل وہ معشوق کہیں اور لگا بیٹھا ہے
تو اسے دل کی ہر اک بات بتاتا کیوں ہے

اُس کو پہلے ہی سے کر رکھا ہے صحرا نے اسیر
اپنے وحشی کو تو زنجیر پنہاتا کیوں ہے

جب انہیں تیرے ہی ہاتھوں سے اجڑنا ہے تو پھر
بستیاں اپنے علاقوں میں بساتا کیوں ہے

جن کو آتا نہیں شمشیر اٹھانے کا ہنر
تو اُنہیں جنگ کے آداب سکھاتا کیوں ہے

خانۂ دل کا اجڑنا مجھے منظور نہیں
تجھ کو جانا ہی اگر ہے تو پھر آتا کیوں ہے

سُر بدل، تال بدل، ساز کی آواز بدل
ایک ہی دُھن پہ مجھے روز نچاتا کیوں ہے

صبح ہوتے ہی یہ ہو جائیں گے خود ہی خاموش
صبح سے پہلے چراغوں کو بجھاتا کیوں ہے

دل سے کب سلجھے گا یہ میرے ترے عشق کا پیچ
یار میرے تو اُسے بیچ میں لاتا کیوں ہے

زخم ایسا تو نہیں دل پہ لگا ہے تیرے
عشق میں شور انیسؔ اتنا مچاتا کیوں ہے

○

پہن کے پیرہنِ رنگ و بو نکلتا ہے
کس اہتمام سے وہ خوبرو نکلتا ہے

عجب ہے شہر کی مخلوق جس کو چھوتا ہوں
گلے سے تیر بدن سے لہو نکلتا ہے

میں تجھ کو وسعتِ دل میں کہاں کہاں دیکھوں
ہر ایک پردۂ منظر سے تو نکلتا ہے

کوئی بھی نقش بناؤں تو اس کے رنگوں سے
وہی نکلتا ہے اور ہو بہو نکلتا ہے

میں جس کے نور سے رہتا ہوں راہ میں روشن
وہ آفتاب پسِ جستجو نکلتا ہے

میں اس کو شہر کی گلیوں میں ڈھونڈتا ہوں مگر
مرا غزال سرِ دشتِ ہو نکلتا ہے

عجیب شہر ہے جس گھر پہ دیجیے دستک
کھلے اگر تو ہمارا عدو نکلتا ہے

○

ہم تو بس یوں ہی عدالت میں بلائے گئے ہیں
فیصلے سارے ترے حق میں سنائے گئے ہیں

ان پہ جاناں ترے ہی نام لکھائے گئے ہیں
جو مرقعے ورقِ دل پہ سجائے گئے ہیں

کچھ بتا خلق کو بھی ان کی خطائیں کیا ہیں
تیرے زنداں میں جو زنجیر میں لائے گئے ہیں

موجۂ خوں میں بہت اب کے روانی ہوئی ہے
سر بہت اب کے سنانوں پہ چڑھائے گئے ہیں

ہم کسی ہاتھ پہ بیعت نہیں کرتے سو حضور
کس لیے آپ کی خدمت میں بلائے گئے ہیں

والیِ شہر عجب ہے یہ ترے عدل کا ڈھنگ
جو ستائے نہ گئے تھے وہ منائے گئے ہیں

جن میں سب چاند نظر آتے ہیں گہنائے ہوئے
کیا تجھے بھی وہی آئینے دکھائے گئے ہیں

روشنی قطع نہ کر ان کی کہ اب کے یہ چراغ
بڑی مشکل سے ہواؤں میں جلائے گئے ہیں

یاد زخموں کا ہے لگنا پہ نہیں یاد مجھے
کب لگائے گئے ہیں کتنے لگائے گئے ہیں

شہر میں اب کے ہوئے کون سے قلعے مسمار
فتح کے باجے بہت زور بجائے گئے ہیں

ہے قصیدہ تو پرانا مگر اس میں کچھ شعر
نئے حاکم کی ستائش میں بڑھائے گئے ہیں

سب گلی کوچے یہاں کے ہمیں پہچانتے ہیں
ہم ترے شہر میں جاناں بہت آئے گئے ہیں

ہم اُنہیں صبح پرستوں کے جگائے ہوئے ہیں
جو شبِ ظلم تہِ تیغ سلائے گئے ہیں

یہ جو اشعار یہاں میں نے سنائے ہیں انیسؔ
یہ گہر ہیں جو سرِ بزم لٹائے گئے ہیں

○

کل تھی اپنی چشم سے کتنی پریشانی مجھے
دیکھنا مشکل تھی اس کی نیم عریانی مجھے

سبز پوشاکیں پہن کر آئی تھی میرے لیے
رنگ اس کے جسم پر اچھے لگے دھانی مجھے

روز کھلتے جا رہے ہیں دشت میں وحشت کے پھول
راس آتی جا رہی ہے چاک دامانی مجھے

کون سا خورشید روشن ہو کہ آئے کچھ نظر
تیرے چہرے کی چمک اور تن کی تابانی مجھے

پڑھ رہا ہوں روز میں اس کے سراپا کے خطوط
دے رہی ہے روشنی اس کی بدن خوانی مجھے

آئینے کے سامنے مصروفِ آرائش ہے وہ
کاش ہو جائے ودیعت اُس کی مژگانی مجھے

سینۂ روشن کے مہتابوں کا منظر دیکھ کر
اپنی ہر خواہش نظر آتی ہے نورانی مجھے

ہے مرا اس کے بدن کی سلطنت پر اختیار
خوش نہ آئے گی مگر اک شب کی سلطانی مجھے

تو کہے تو خانۂ تن میں کروں میں روشنی
خوب آتا ہے یہ کارِ نور افشانی مجھے

یوں بھی تیرا نقش لاثانی بنا سکتا ہوں میں
کر رہا ہے کیوں فراہم خامۂ مانی مجھے

ختم ہو جائے نہ اس کے حسن کا موسم کہیں
وصل دکھلائے نہ اس کے تن کی ویرانی مجھے

تھم نہ جائیں ایک دن مجھ میں لہو کی گردشیں
اور زوالِ آرزو پر ہو پشیمانی مجھے

زندگی بھر کی زلیخائی اسے دے اے خدا
عمر بھر رہنے دے یونہی یوسفِ ثانی مجھے

○

کیا خرام آموز ہیں دل کے غزال
چال ٹیڑھی ہو کسی کی کیا مجال

بج رہی ہیں روز زنجیریں بہت
اِن دنوں اچھا نہیں زنداں کا حال

حسن کی شمشیر چمکی جب کبھی
عشق کو میں نے بنایا اپنی ڈھال

تو بلندی پر نہ ہو نازاں بہت
دیکھ وہ سورج اسے بھی ہے زوال

ہجر کی شب ہوگئی پوری مگر
بام پر آیا نہ خورشیدِ وصال

لفظ موزوں تجھ کو مل جائیں اگر
شعر میں تیرے چمک جائے خیال

پھر کسی پیکر میں کب آیا نظر
اس کی آنکھیں اس کا قد اس کا جمال

دوسرا اس کا سا کب ہے شہر میں
وہ ہے وہ جو آپ ہے اپنی مثال

اپنا دکھ، غیروں کا دکھ، دنیا کا دکھ
ایک ہے دل اس میں اتنے غم نہ پال

سب زبانیں بند ہوجائیں گی جب
حاکموں سے کون پوچھے گا سوال

پھر وہی ہیں طائروں کی وحشتیں
پھر اسی صیاد نے پھینکا ہے جال

میں ہمیشہ کا ہوں شائستہ کلام
تو کہاں کا ہے زباں اپنی سنبھال

ایک سے دن ایک سی راتیں ہیں سب
کیا کوئی رکھے حسابِ ماہ و سال

سلطنت اس کی نہ سلطانی رہی
چار دن کا تھا وہ سب جاہ و جلال

نور میں پھر ڈوبنے والا ہوں میں
پھر چمکنے کو ہے وہ مہرِ ملال

تیغ تو ماری تھی اس نے تول کر
میری قسمت بچ گیا میں بال بال

ڈھونڈتے ہو ہر طرف تم کیوں انیسؔ
لکھنؤ میں اب کہاں صاحب کمال

○

فراست رضوی کے لیے

یہی ہے ظلمتِ شب میں صدائے آخرِ شب
کہ چاک ہو کے رہے گی قبائے آخرِ شب

وہ جن کی لَو سے مرے بام و در منوّر تھے
وہی چراغ ہوا نے بجھائے آخرِ شب

طلوعِ مہر سے ہوگی نہ ختم ظلمتِ شب
کہو کسی سے کہ چہرہ دکھائے آخرِ شب

ابھی ابھی تو پرندوں کو نیند آئی ہے
کوئی قفس میں نہ اُن کو جگائے آخرِ شب

وہ جس کو سن کے مرا شہر کانپ جاتا ہے
وہی پیام نہ لائے ہوائے آخرِ شب

بجھیں گے ہم نہ کسی طور صبح سے پہلے
چراغ ہیں تو ہیں روشن برائے آخرِ شب

ڈھلی جو رات تو یاد اُس کی اور آئی مجھے
ہوئی نہ مجھ سے الگ یہ بلائے آخرِ شب

ستارے ڈوبتے جاتے ہیں اور بیٹھا ہے
ترے لیے کوئی مسند بچھائے آخرِ شب

ہمارا نام بھی نالہ کشوں میں شامل ہو
وہ ایک بار ہمیں یاد آئے آخرِ شب

میں اک مصلّیِ شب ہوں مرے لبوں پہ انیسؔ
ہے روشنی کی دعا ہی دعائے آخرِ شب

○

اسے خبر ہے کوئی لَو کترنے والا ہے
جو شمع رات کے زینے پہ دھرنے والا ہے

اسے ہے وصل کی وحشت سو وہ ستارۂ جاں
مرے بدن کی زمیں پر اترنے والا ہے

پھر اُس گلی کی طرف اٹھ رہے ہیں میرے قدم
یہ عشق پھر مجھے بدنام کرنے والا ہے

اک اور ناخنِ کاوش کی پھر ضرورت ہے
جو زخم اس نے دیا تھا وہ بھرنے والا ہے

زمینِ کوچۂ وحشت سجی ہوئی ہے بہت
کوئی غزال اِدھر سے گزرنے والا ہے

ہے میرے سامنے تیشہ بھی کوہ بھی لیکن
یہ دل تو اور کوئی کام کرنے والا ہے

بس ایک معرکۂ حق میں اس کی آب گئی
عدو کی تیغ سے اب کون ڈرنے والا ہے

○

وہ نورگاہِ شب کے نظارے نہیں رہے
تھے آسماں پہ جتنے ستارے، نہیں رہے

خِلعت ملا تو خیمے بھی ان کے بدل گئے
کل تک جو تھے ہمارے، ہمارے نہیں رہے

رہتی تھی جن کی پیاس سے ہر موج مضطرب
کیا تشنہ لب وہ نہر کنارے نہیں رہے

اس عشق میں تھے ہم تو زیادہ وفا شعار
لیکن یہ کیا کہ ہم بھی تمہارے نہیں رہے

جن کے ورق ورق پہ تھے خورشید و ماہتاب
روشن وہ روشنی کے سپارے نہیں رہے

اب بھی ہیں تیری بزم میں کیا کیا غزال چشم
لیکن وہ ابروؤں کے اشارے نہیں رہے

باشندگانِ شہرِ ستم کا نہ پوچھ حال
کس کا کروں میں ذکر کہ سارے نہیں رہے

تھا ہاتھ میں عصائے قناعت سو عمر بھر
اس کے سوا کسی کے سہارے نہیں رہے

○

فرار خوفِ عدو سے قبیلے والے ہوئے
اکیلا میں ہی کھڑا ہوں علم سنبھالے ہوئے

گلی میں اس کی بھی ہو آنا چاہیے مجھ کو
بہت دنوں سے ہوں میں دل کی بات ٹالے ہوئے

کھڑے ہیں دونوں کسی فیصلے کے ہونے تک
میں سر بڑھائے ہوئے تیغ وہ نکالے ہوئے

کوئی ستارہ بلاتا ہے مجھ کو اپنی طرف
قبائے نور سے چہرہ ذرا نکالے ہوئے

وہ تیری شمع ہو، میرا دیا کہ اس کا چراغ
کسی کا نور سہی راہ میں اجالے ہوئے

○

ستارہ چشم نہ خورشید لب نظر آئے
تمہاری بزم میں چہرے عجب نظر آئے

اُس انجمن میں ہمیں یوں تو سب نظر آئے
گئے تھے دیکھنے جن کو وہ کب نظر آئے

سکھائے تھے جنہیں آدابِ بندگی تو نے
ترے حضور وہی بے ادب نظر آئے

جو بارگاہِ قناعت میں ایک پل نہ رکے
وہ پیشِ تختِ شہی روز و شب نظر آئے

تو جان لے کہ یہی ہے مرا ترا ابھی غروب
کوئی ستارہ دمِ صبح جب نظر آئے

نظر تو آنے کو وہ آئے اے انیسؔ مگر
جب آنکھ ہونے لگی بند تب نظر آئے

○

اسی زمیں پہ اسی آسماں میں رہنا ہے
ترا اسیر ہوں تیرے جہاں میں رہنا ہے

میں ایک پل تری دنیا میں کیا قیام کروں
کہ عمر بھر تو مجھے رفتگاں میں رہنا ہے

اُتر گئی ہے تو سینے سے مت نکال اسے
کہ میرے خون کو تیری سناں میں رہنا ہے

میں جانتا ہوں بہت سخت دھوپ ہے لیکن
سفر میں ہوں تو صفِ رہرواں میں رہنا ہے

نہ میرے جسم میں میرے لہو کو رُکنا ہے
نہ تیرے تیر کو تیری کماں میں رہنا ہے

کھلے رہیں جو کھلے ہیں قفس کے دروازے
وہ کب چھٹیں گے جنہیں قیدِ جاں میں رہنا ہے

تو پھر یہ زندگیِ جاوداں کا ملنا کیا
جو ہر نفس نفسِ رائیگاں میں رہنا ہے

○

قمری طوطی عندلیب
کب چمن کو ہیں نصیب

عشق میں رسوا ہیں سب
کم نسب ہوں یا نجیب

کب مرض اچھا ہوا
آزمائے سب طبیب

حرف دشمن بادشا
بے قلم سارے ادیب

کب کسی پر وہ کھلا
رمز ہیں اس کے عجیب

پاس رہ کر بھی وہ دور
دور رہ کر بھی قریب

عشق اس سے کیا کیا
بن گئے کتنے رقیب

دیں فروش و یاوہ گو
آج کے سارے خطیب

وصل اس کا ہوگیا
جاگ اٹھے میرے نصیب

یہ مدد کا وقت ہے
کیا ہوئے میرے حبیب

تیرے لطفِ چشم سے
ہے غنی تیرا غریب

لرزشیں ہیں پاؤں میں
اور نہیں کوئی جریب

سرفرازی کا نشاں
دشتِ ہو میں اک صلیب

○

منزل سراب کی نہ ٹھکانہ ہے آب کا
یونہی سفر تمام ہوا میرے خواب کا

میرے لہو کی شمع سے کرتا ہے کسبِ نور
روشن مری ضیا سے ہے گھر آفتاب کا

لکھا ہے میں نے خامۂ خوں سے ورق ورق
زندہ ہے ہر سبق مرے دل کی کتاب کا

کیا کیا چنے ہیں میں نے زمینِ چمن سے پھول
شہرہ ہے شہرِ گل میں مرے انتخاب کا

اب بھی سجا ہے تحفۂ گل میرے طاق میں
تازہ ہے اب بھی واقعہ عہدِ شباب کا

کیوں لے کے جاؤں کوئی قصیدہ حضورِ شاہ
خلعت سے کچھ لگاؤ نہ طالب خطاب کا

پیشِ کمانِ ظلم لبوں کی شگفتگی
''کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا''[1]

کہہ کر غزل یہ لائے ہیں جس کی زمین میں
مسکن ہمارے شہر میں ہے اس جناب کا

---

[1] یہ غزل ٹورنٹو (کناڈا) کے ایک طرحی مشاعرے میں پڑھی گئی جس کی طرح انیس کے ایک سلام کے اس مصرعہ پر رکھی گئی تھی: 'کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا'۔

○

مطلب اگر اس تک کوئی پہنچا نہیں ہوگا
تو اس نے مرے حرف کو سمجھا نہیں ہوگا

جب وہ مرا حاکم تھا تو کیا کیا نہ ہوا تھا
اب تو مرا حاکم ہے تو کیا کیا نہیں ہوگا

یہ شہر تو ہوگا نہ پری چہروں سے خالی
تیرا سا مگر کوئی سراپا نہیں ہوگا

دیکھے گا نہ تیروں کی طرف خندہ ستارہ
نیزوں کے لیے سینہ کشادہ نہیں ہوگا

وہ رات بھی آئے گی کہ ڈوبے گا ترا چاند
اور بامِ فلک پر کوئی تارا نہیں ہوگا

اب خلق کو منظور نہیں تیری خدائی
اب جیسا ترا حکم ہے ویسا نہیں ہوگا

اب اور ترے بت کی پرستش نہیں ہوگی
اب اور ترے سامنے سجدہ نہیں ہوگا

اب اور درختوں سے یہ پتے نہ گریں گے
اب اور ہوا کا یہ تماشا نہیں ہوگا

آجائے گا وہ زیرِ قدم سر سے اتر کر
یہ تاجِ شہی نے کبھی سوچا نہیں ہوگا

جتنے بھی دکھانا ہیں دکھا تیغ کے جوہر
اب تیرے مقابل کوئی مجھ سا نہیں ہوگا

اب چپ نہ رہیں گے ترے آگے ترے مظلوم
اب تو نے ستم ڈھایا تو اچھا نہیں ہوگا

پابندِ عطش اب نہیں دریا کہ سرِ آب
ہوگا کوئی پیاسا تو وہ پیاسا نہیں ہوگا

اس شب کو ہے اک تازہ چراغاں کی ضرورت
بجھتی ہوئی شمعوں سے اجالا نہیں ہوگا

دستک نہ دی اس نے کبھی دروازۂ دل پر
یہ سوچ کے گھر میں کوئی رہتا نہیں ہوگا

آؤں گا میں اس وقت ترے خانۂ دل میں
جب کوئی ترا چاہنے والا نہیں ہوگا

○

کب عشق میں یاروں کی پذیرائی ہوئی ہے
ہر کوہکن و قیس کی رسوائی ہوئی ہے

یہ کوہِ عشق میں نے تراشا ہے مری جان
تجھ تک یہ جوئے شیر مری لائی ہوئی ہے

وہ عشق کی زنجیر جو کاٹے نہیں کٹتی
پیروں میں وہ تیری ہی تو پہنائی ہوئی ہے

اس شہر میں کیا چاند چمکتا ہوا دیکھیں
اس شہر میں ہر شکل تو گہنائی ہوئی ہے

جو تیرے خزانے کے لیے لوحِ شرف ہے
وہ مُہرِ جواہر مری ٹھکرائی ہوئی ہے

یہ تختِ صبا، خلعتِ گل، کرسیِ مہتاب
سب تیرے لیے انجمن آرائی ہوئی ہے

شہرہ ہے بہت جس کی تلاوت کا چمن میں
وہ آیتِ گل میری ہی پڑھوائی ہوئی ہے

تھی جو نہ کسی شانۂ یوسف کی طلبگار
وہ زلفِ زلیخا مری سودائی ہوئی ہے

ہر دشت ہے روشن اُسی آہو کے قدم سے
ہر شاخ اُسی پھول کی مہکائی ہوئی ہے

○

زندہ تھے جن میں ہم وہ فسانے چلے گئے
واحسرتا ہمارے زمانے چلے گئے

کب اس نے رنج عشق وجنوں میں اُٹھائے ہیں
کیوں اس کو دل کا حال سنانے چلے گئے

یوں کھولتا نہ در سو ہم اس کے مکان پر
اوروں کو پوچھنے کے بہانے چلے گئے

مرہم کی جستجو میں رفو کی تلاش میں
ہم اپنے زخم اس کو دکھانے چلے گئے

فرہاد و قیس سے بھی نہ اٹھا تو کس لیے
ہم عشق کا یہ بوجھ اٹھانے چلے گئے

پہچانتے تھے سب گلی کوچوں کو جن سے ہم
کیا جانیے کہاں وہ ٹھکانے چلے گئے

اچھا لگا نہ جب ہمیں خورشید کا جمال
پردہ تمہارے رخ سے اٹھانے چلے گئے

خالی رہی کبھی نہ تری بارگاہِ عشق
جب آ گئے نئے تو پرانے چلے گئے

کرتا نہ کوئی روشنی ویران شہر میں
سو ہم وہاں چراغ جلانے چلے گئے

اب کے تھا نفع خوب سو بازارِ عشق میں
ہم بھی دکان اپنی لگانے چلے گئے

کرتے تھے جن پہ خشت زنی طفل شہر کے
اب شہر سے کہاں وہ دوانے چلے گئے

اب لکھنؤ لٹا ہوا اک شہر ہے انیسؔ
حرف و ہنر کے یاں سے خزانے چلے گئے

○

روئے گل چہرۂ مہتاب نہیں دیکھتے ہیں
ہم تری طرح کوئی خواب نہیں دیکھتے ہیں

سینۂ موج پہ کشتی کو رواں رکھتے ہیں
گرد اپنے کوئی گرداب نہیں دیکھتے ہیں

تشنگی میں بھی وہ پابندِ قناعت ہیں کہ ہم
بھول کر بھی طرفِ آب نہیں دیکھتے ہیں

تجھ سے رشتہ ہے وہی عشق میں اب بھی لیکن
دل کو تیرے لیے بیتاب نہیں دیکھتے ہیں

سر بھی موجود ہیں شمشیرِ ستم بھی موجود
شہر میں خون کا سیلاب نہیں دیکھتے ہیں

آ گئے ہیں یہ مرے شہر میں کس شہر کے لوگ
گفتگو میں ادب آداب نہیں دیکھتے ہیں

آنا جانا اُنہیں گلیوں میں ابھی تک ہے مگر
اب وہاں مجمعِ احباب نہیں دیکھتے ہیں

اس پہ حیراں ہیں خریدار کہ قیمت ہے بہت
میرے گوہر کی تب و تاب نہیں دیکھتے ہیں

کس چمن میں ہیں کہ موسم تو گلوں کا ہے مگر
ایک بھی شاخ کو شاداب نہیں دیکھتے ہیں

○

نہ یوں آنکھیں دکھا کر آ نہ یوں تیور بدل کر آ
مقابل میرے آنا ہے تو آ لیکن سنبھل کر آ

میں شعلوں میں لپٹ کر اس کے دروازے تک آیا ہوں
مکانِ عشق تک اب تو بھی انگاروں پہ چل کر آ

میں امشب خانۂ مہتاب میں لے جاؤں گا تجھ کو
مرے گھر آج کی شب نور کے سانچے میں ڈھل کر آ

ہیں سب دیدہ وراں حیراں ازل کیا تھا ابد ہے کیا
اگر سمجھا ہے تو اِن کو معمّا جا کے حل کر آ

اسی میدانِ خوں میں اب ہمارا فیصلہ ہوگا
اِدھر سے میں نکلتا ہوں اُدھر سے تو نکل کر آ

جو روشن کی ہیں تو نے اپنے خوں میں نور کی شمعیں
ہمارے خانۂ تن میں اُنہیں شمعوں میں جل کر آ

کھنگالوں کیوں تجھے اے حرف کے موتی کہ تو خود ہی
مرے طشتِ سخن میں بحر کی تہ سے اُچھل کر آ

○

تشنگی کی صدائیں آتی ہیں
یاد جب کربلائیں آتی ہیں

جان دینے پہ سب ہیں آمادہ
اس کو ایسی ادائیں آتی ہیں

جن درختوں سے خوں برستا ہو
اُن پہ کب فاختائیں آتی ہیں

سوکھتے جا رہے ہیں سبز شجر
کس طرف سے ہوائیں آتی ہیں

شب کو پہنے ہوئے تری یادیں
روشنی کی ردائیں آتی ہیں

سوزنِ مہر سے اے پیکرِ نور
سِل کے تیری قبائیں آتی ہیں

جن کا سایہ سروں پہ تھا، اب بھی
یاد ان کی دعائیں آتی ہیں

آج بھی کوچۂ عدم سے انیسؔ
رفتگاں کی صدائیں آتی ہیں

○

دھوپ تھی اور راہ میں کوئی شجر آتا نہ تھا
تھے سفر میں ہم کئی دن سے کہ گھر آتا نہ تھا

کُھل چکے تھے اس پہ میری تیغ کے جوہر بہت
اب کسی میدان میں وہ بے سپر آتا نہ تھا

موج اندر موج ہم تو بحر کی گردش میں تھے
اور صدف کے بطن میں کوئی گہر آتا نہ تھا

شہر کے اندر تھے جس میں بام و در ڈوبے ہوئے
شہر کے باہر وہ سیلِ خوں نظر آتا نہ تھا

اس طرح برسوں رہا میں اُس حسیں کا منتظر
پوچھتا تھا روز میرا گھر مگر آتا نہ تھا

اس کی مٹھی میں جواہر تھے نظر میری طرف
اور مجھے پیرایۂ عرضِ ہنر آتا نہ تھا

رم تو کرتا تھا میں اس کے ساتھ وحشت میں بہت
وہ غزالِ دشت لیکن راہ پر آتا نہ تھا

○

اہلِ بینش سے نہ صاحب نظراں سے پوچھو
دشت کا حال تو وحشت زدگاں سے پوچھو

ہم تو ہر روز پڑھا کرتے ہیں یہ پارۂ غم
یاد ہیں ہم کو سبق سارے، جہاں سے پوچھو

کیسے دریا کی طرف تشنہ دہن آتے ہیں
جاکے دریا پہ کبھی آبِ رواں سے پوچھو

اور کوئی نہ بتائے گا، وہی جانتا ہے
سب مرا حال مرے حرفِ زیاں سے پوچھو

کیوں ہوئے خاک بہ سر کیسے ہوئے خانہ خراب
پوچھنا ہے تو یہ سب حسنِ بتاں سے پوچھو

ہے کتابِ دلِ مضطر پہ رقم ایک سا حال
کیوں کہوں پوچھنے والے سے، یہاں سے پوچھو

تابہ کے طبل و علم، جاہ و حشم کتنی دیر
تاج اترے ہوئے سرہائے شہاں سے پوچھو

سر جھکے رہتے ہیں جن کے وہ بھلا کیا جانیں
تن کے چلنے کا مزہ کجکلہاں سے پوچھو

چُھٹ کے وہ آ تو گئے میرے گلو تک لیکن
تیر حیراں ہوئے کتنے یہ کماں سے پوچھو

○

غروب ہوتا ہوا اک ستارہ ملتا ہے
ہر ایک صبح فنا کا اشارہ ملتا ہے

میں راہ دیکھ رہا ہوں گذشتگاں کی مگر
گذشتگاں میں کوئی کب دوبارہ ملتا ہے

جو میرا ذکر نہیں مصحفِ زیاں میں کہیں
تو روز کیوں مجھے غم کا سپارہ ملتا ہے

کسی میں کوئی عبارت نئی نہیں ہوتی
اگرچہ روز نیا اک شمارہ ملتا ہے

سخن میں پہلے تو خوں کا تماشا ہوتا ہے
پھر اس کے بعد جگر پارہ پارہ ملتا ہے

دکھاؤں کیسے تجھے رنجِ رائیگاں کا حساب
کہ حرف سوز مرا گوشوارہ ملتا ہے

میں جس کے تاج پہ ٹھوکر لگا کے آیا تھا
اسی کے در سے مجھے اب گزارہ ملتا ہے

عجب ہے تندیِ طغیانیِ ہنر کہ جہاں
شناوروں کو بھی کم ہی کنارہ ملتا ہے

○

ہوئے نیرنگِ منظر سے پریشان ہے کیوں
آنکھ تیری صفتِ آئنہ حیران ہے کیوں*

شہر سے میں تو گیا ہی نہیں صحرا کی طرف
چاک پھر اہلِ جنوں میرا گریبان ہے کیوں

کل ہی آباد ہوئے تھے یہاں آ کر ہم لوگ
آج کیا ہوگیا بستی مری ویران ہے کیوں

پہلے ہر موڑ پہ اک پیچ ہوا کرتا تھا
راستہ عشق کی منزل کا اب آسان ہے کیوں

---

* اقبال کا مصرعہ

بے سر و برگ ہی جب اس کی طرف جانا ہے
پھر ترے ساتھ سفر میں ترا سامان ہے کیوں

شہر کے سارے پری چہرہ یہیں رہتے ہیں
پوچھتا کیوں ہے کہ دل میرا پرستان ہے کیوں

اب کے بدلا ہوا لگتا ہے اسیری کا نظام
قید زندان کی زنجیروں میں زندان ہے کیوں

جنگ کرنے کا اگر شوق ہے میداں میں اتر
آزمانے کے لیے جنگ کا اعلان ہے کیوں

سرحدِ شہر پہ لشکر ہیں نہ ہیں طبل و علم
پھر مرے شہر کے لوگوں میں یہ ہیجان ہے کیوں

○

لکھنؤ سے کراچی آمد پر

صفِ ستم سے نہ فوجِ عدو سے آئے ہیں
تمہارے شہر میں ہم لکھنؤ سے آئے ہیں

تمہاری یاد کے آہو جہاں رمیدہ ہیں
ہم اِس گلی میں اُسی دشتِ ہُو سے آئے ہیں

محبتوں کی پری جس میں غسل کرتی ہے
بدن یہ دھو کے اُسی آبجو سے آئے ہیں

جہاں کی روشنی تم کو تلاش کرتی ہے
اُسی ستارہ گہِ جستجو سے آئے ہیں

رہیں گے سبز گلستانِ گفتگو کے شجر
خبر یہ سن کے ہوائے نمو سے آئے ہیں

ہے دوستی کی مہک جن ہوا کے جھونکوں میں
وہ سب ہمارے گلِ آرزو سے آئے ہیں

برائے خاطرِ جاں دادگانِ تیغ ستم
سجا کے پیرہن اپنا لہو سے آئے ہیں

اکیلے خون میں تم ہی نہیں ہو تر کہ یہ تیر
ہمارے جسم پہ بھی چارسو سے آئے ہیں

○

شہر میں کیسی عدالت یہ بنا دی گئی ہے
جرم سے پہلے سزا مجھ کو سنا دی گئی ہے

عشق کی لوح پہ کل اپنے لہو سے ہم نے
وہ جو تحریر لکھی تھی وہ مٹا دی گئی ہے

کل مجھے نور کے شعلوں میں جلایا گیا ہے
اور مری خاک ہواؤں میں اڑا دی گئی ہے

وہ جو میداں کی طرف تیغ بکف جاتے تھے
مقتلوں کی انہیں روداد سنا دی گئی ہے

دودھ کی نہر نہ پریاں نہ وہ اڑتے ہوئے تخت
خیمۂ خواب میں کیا آگ لگا دی گئی ہے

دور تک پھر نظر آئے گا دھواں پھیلا ہوا
کل مرے شہر میں شعلوں کو ہوا دی گئی ہے

کیوں سرِ آب کوئی ہوتا نہیں ہے سیراب
بندشِ آب تو دریا سے ہٹا دی گئی ہے

کس کی خدمت میں ابھی تک ہیں کنیزانِ سحر
بانوئے شب تو سرِ شام سلا دی گئی ہے

کل ہی صحرا سے ملا ہے مجھے پروانۂ رم
اور کل ہی مجھے زنجیر پنہا دی گئی ہے

طشت لے کر مری جاگیرِ سخن میں آ جاؤ
دولتِ حرف بہت اب کے لٹا دی گئی ہے

○

نوحۂ پشاور

۱۶ر دسمبر ۲۰۱۴ء کو مکتب میں شہید ہونے والے معصوم بچوں اور
سنگینوں کے سامنے آ جانے والی شیر دل خاتون کے نام

تری ظالم زمیں پر خوں کے منظر دیکھنے جاؤں
تجھے میں کس لئے شہرِ پشاور دیکھنے جاؤں

ہوئے تھے جن پہ روشن حرف آئندہ زمانوں کے
بریدہ ظلم کی تیغوں سے وہ سر دیکھنے جاؤں

خبر کیا تھی جو سر پر ہے اتر جائے گی مقتل میں
لہو کے داغ ہیں جس پر وہ چادر دیکھنے جاؤں

وہ جن سے چاندسی پیشانیوں پر زخم آئے ہیں
میں دستِ سنگ باراں میں وہ پتھر دیکھنے جاؤں

صفیں جو روشنیوں کے سبق پڑھنے کو نکلی تھیں
انہیں بارانیِ آتش میں ابتر دیکھنے جاؤں

نگہبانِ شہیدانِ ستم وہ شیر دل عورت
میں اُس کے خانۂ ویراں کا منظر دیکھنے جاؤں

بدن وہ شاخِ گل جیسے وہ ماہ و مہر سے چہرے
میں ان سب کی قبائیں خون سے تر دیکھنے جاؤں

جنہیں محروم رکھا برقِ سوزاں نے دمکنے سے
چمک چھینی گئی جن کی وہ گوہر دیکھنے جاؤں

ہمکتے دوڑتے تھے جن میں طفلانِ شگفتہ رو
وہ خالی گودیاں اجڑے ہوئے گھر دیکھنے جاؤں

برادر چھٹ گیا جس سے پدر نے کھو دیا جس کو
وہ خواہر دیکھنے جاؤں وہ دختر دیکھنے جاؤں

گرے ہیں زخم کھا کھا کر جو خاکِ ارضِ مکتب پر
نہ پہنچے لوٹ کر جو گھر وہ دلبر دیکھنے جاؤں

علم نوزادگاں کے قتل پر اونچے کیے جس نے
میں اس ظالم کا اس قاتل کا لشکر دیکھنے جاؤں

لہو جس نے کیے آموزگانِ حرف کے سینے
وہ نیزہ دیکھنے جاؤں وہ خنجر دیکھنے جاؤں

گلوں کے قتل پر تاجِ شجاعت جس نے پہنا ہے
ستم کی سلطنت کا وہ سکندر دیکھنے جاؤں

جہاں سیلابِ خوں میں سب ورق سارے قلم ڈوبے
میں ایسے مدرسے کے روزن و در دیکھنے جاؤں

جو اڑنے کے لیے پر تولنے والا تھا شاخوں سے
میں اس طائر کے اب ٹوٹے ہوئے پَر دیکھنے جاؤں

جو تھے کرسی نشینانِ دبستانِ مہ و انجم
میں اب زیرِ زمیں ان سب کے بستر دیکھنے جاؤں

وہ جو بغداد میں برپا ہے کابل میں کراچی میں
وہی ہنگامۂ خوں اُس زمیں پر دیکھنے جاؤں

ادھر بھی اس طرف بھی اُس طرح کی آگ روشن ہے
میں شعلوں میں کدھر جلتے ہوئے گھر دیکھنے جاؤں

یہاں بھی بام و در ڈوبے ہوئے ہیں جس کی موجوں میں
وہاں بھی میں وہی خوں کا سمندر دیکھنے جاؤں

دعا

ہوا نے گُل کیا ہے خیمہ گاہِ نور میں جن کو
وہاں جاؤں تو وہ شمعیں منور دیکھنے جاؤں

جنہیں رکھا گیا تھا ظلم کے زندانِ ظلمت میں
انہیں، جاؤں تو مثلِ ماہ و اختر دیکھنے جاؤں

بہشتِ جاں میں جو کمھلا گئے کھلنے سے پہلے ہی
شگفتہ میں وہی پھولوں کے پیکر دیکھنے جاؤں

جو اونچا ہو رہا ہے ہر طرف، اس کوہِ باطل کو
زمیں پر جو گرا دے وہ دلاور دیکھنے جاؤں

بہت اونچے اٹھائے جا رہے ہیں ظلم کے نیزے
میں ان نیزوں پہ حرفِ حق منور دیکھنے جاؤں

اٹھے شمشیر بھی نیزہ بھی خنجر بھی وہاں لیکن
اُنہیں اٹھتا ہوا پیشِ ستمگر دیکھنے جاؤں

جو حق بولیں جو حق سمجھیں جو حق پر جان دیں اپنی
بہادر کربلا جیسے بہتر دیکھنے جاؤں

○

کسی کی خوبیِ حرفِ نوا سے کیا ہوتا
محیطِ مرگ میں صوت و صدا سے کیا ہوتا

ترا عذاب تھا نازل دعا کے ہاتھوں پر
اٹھاتا ہاتھ تو میری دعا سے کیا ہوتا

تمام حرف تھے حاکم کے ابروؤں کے اسیر
جو بولتی بھی تو خلقِ خدا سے کیا ہوتا

نہ جلنے دیتی وہ جلتے ہوئے چراغوں کو
کچھ اور شہر میں زورِ ہوا سے کیا ہوتا

میں ہو چکا تھا شبِ ظلمتِ جفا کا اسیر
طلوع ہو کے بھی مہرِ وفا سے کیا ہوتا

تھی دل پہ گرد بہت، میری سینہ صافی میں
خلوصِ کاوشِ اہلِ صفا سے کیا ہوتا

خدا کے نام سے نا آشنا تھے لوگ جہاں
وہاں وظیفۂ نامِ خدا سے کیا ہوتا

یہی کہ زینۂ زنداں کو چومتی جا کر
زیادہ کچھ مری زنجیرِ پا سے کیا ہوتا

چمن میں چاروں طرف خشک ہو چکے تھے شجر
ادھر جو آتی تو بادِ صبا سے کیا ہوتا

○

دیکھ تو آ کر کیا کیا جوہر حرف ہنر میں رکھتے ہیں
کیسے کیسے موتی اپنے گنجِ گہر میں رکھتے ہیں

تیر اِدھر سے بھی آنا ہے اور اُدھر سے بھی آنا
دوست ہمارے ہوں یا دشمن سب کو نظر میں رکھتے ہیں

کچھ بھی نہیں لائے تھے وہاں سے کچھ نہ وہاں لے جائیں گے
سو ہم خالی خاک بدن کی کیسۂ زر میں رکھتے ہیں

کیوں نہ ہو خانۂ دل میں ہمارے شمس و قمر کا نور کہ ہم
روشن تیرے نام کی شمعیں طاق و در میں رکھتے ہیں

خنجر تیرے ابرو کا ہو یا ہو دشمن کی تلوار
ہم تو ازل سے مر جانے کا سودا سر میں رکھتے ہیں

روز یہ سارا شہر ہمارا گنجِ شہیداں بنتا ہے
سو ہم ایک کفن بھی اپنے زادِ سفر میں رکھتے ہیں

ہم سے تو اچھے ہیں پرندے تنکے ہوں یا سوکھے پات
ایک ٹھکانہ یہ بھی اپنا شاخِ شجر میں رکھتے ہیں

جن کو تو نے قید کیا ہے جال نہ تیرا جلا ڈالیں
سُن صیاد یہ وحشی طائر شعلے شہپر میں رکھتے ہیں

سچا حال ہمارے دل کا کوئی بھلا کب دیکھ سکا
ہم تو دکھوں کے سارے منظر پس منظر میں رکھتے ہیں

سروقدوں سے ماہ رخوں سے سیم تنوں گل چہروں سے
پوچھ کے آؤ کون سا جادوگر پیکر میں رکھتے ہیں

○

کرم کا سلسلہ پیہم رہے گا
اگر سر پیشِ سلطاں خم رہے گا

میں پی لوں جس قدر بھی میکدے میں
مجھے نشہ ہمیشہ کم رہے گا

مکانِ عشق سے وہ جا رہا ہے
بہت روزوں یہاں ماتم رہے گا

رہے گا کوچۂ دل میں وہ آ کر
مگر اس سے تعلق کم رہے گا

تری آنکھوں کے دریا میں اتر کر
عجب اک موج کا عالم رہے گا

چھڑا تھا جو میانِ حق و ناحق
وہ خوں کا معرکہ پیہم رہے گا

میں دیکھے جاؤں گا تصویر تیری
مری آنکھوں میں جب تک دم رہے گا

محبت سے جو تو نے رکھ دیا ہاتھ
مرے دل پر وہی مرہم رہے گا

یہ جو برپا ہے سب یاروں کا جلسہ
ہوا برہم تو پھر برہم رہے گا

ہرن میرے چلے جائیں بھلے ہی
مگر جنگل میں ان کا رم رہے گا

لہو کی موج بہتی ہی رہے گی
جو دیدہ نم ہوا ہے نم رہے گا

○

باقی نہیں بام و در و دیوار کی خوبی
کیا تھی کبھی اس شہر کے آثار کی خوبی

پھولوں کا ہے مجمع نہ پرندوں کی قطاریں
رخصت ہوئی گلشن سے وہ اشجار کی خوبی

لشکر کو مرے سامنے لے آ تو بتاؤں
پیکار میں کیا ہے مری تلوار کی خوبی

دانہ بھی اٹھائے یہ ٹھکانہ بھی بنائے
دہری ہے پرندے تری منقار کی خوبی

حرفوں میں نہ ہوں بند معانی کے مہ و مہر
ہے عرضِ ہنر میں یہی اظہار کی خوبی

انعام جنہیں آج ملا ہے وہی کل سے
ہر عیب کو بتلائیں گے سرکار کی خوبی

لگتے ہیں یہاں وعدہ فروشی کے بہت دام
جاناں ہے یہی عشق کے بازار کی خوبی

تو جھوٹ کو سچ مجھ سے کہلوائے گا جس دن
ہو جائے گی ظاہر مرے انکار کی خوبی

وہ پیشِ رقیباں بھی ہے میرا ہی طرفدار
اوروں سے الگ ہے مرے دلدار کی خوبی

ہر لفظ ہے مہتاب ہر اک حرف ہے خورشید
ہے سب سے جدا اُس لبِ گفتار کی خوبی

حیراں ہیں اگر لعل تو یاقوت پریشاں
کس درجہ ہے تیرے لب و رخسار کی خوبی

وہ تم سے اتر آیا جو تو پر تو ہوا یوں
کچھ اور فزوں ہوگئی تکرار کی خوبی

آتا ہے مجھے دشت کا ایک ایک ہرن یاد
ہوتی ہے بیاں جب تری رفتار کی خوبی

○

صدف کے بطن نہ گنجِ طلا سے ملتا ہے
گہر جو ملتا ہے دستِ دعا سے ملتا ہے

بس ایک جامۂ زرّیں بس ایک کیسۂ زر
جز اس کے اور کیا شہ کی ثنا سے ملتا ہے

تو کیوں پڑا ہے مرا کاسۂ طلب خالی
سنا تھا میں نے بہت کچھ دعا سے ملتا ہے

اگر نہ ہو تو کہاں یہ چمن کھلیں کہ ہمیں
یہ سب نمو کا خزانہ ہوا سے ملتا ہے

ہر ایک حلقہ رہائی کی مے سے ہے سرشار
نشہ عجیب سا زنجیرِ پا سے ملتا ہے

پکارا میں تو وہ بولا کہ اس کا لہجہ تو
اسی گلی میں کسی کی صدا سے ملتا ہے

کہاں نگاہ ہے بندوں کی اب خدا کی طرف
کہ جیسے رزق تو کذب و ریا سے ملتا ہے

وہی عطش کی صدائیں وہی ہے بندشِ آب
ہمارا قریۂ جاں کربلا سے ملتا ہے

میں اُس کے سامنے آنے سے کیوں ڈروں گا انیسؔ
مجھے تو حوصلہ تیغِ جفا سے ملتا ہے

○

نے دشت نہ جنگل نہ بیابان میں چھوڑ آئے
وحشت کو تو ہم چاک گریبان میں چھوڑ آئے

شاید وہ ہمیں سوچ رہے ہوں سو ہم ان کو
جس دھیان میں بیٹھے تھے اسی دھیان میں چھوڑ آئے

ایک اور اسیری کا سفر ہے ابھی درپیش
کیوں پاؤں کی زنجیر کو زندان میں چھوڑ آئے

پایا تھا جسے ہم نے بہت رنج اٹھا کر
بگڑی تو اُسی یار کو اک آن میں چھوڑ آئے

وہ بھی تو ہوئے غرق اسی سیلِ بلا میں
جو لوگ سفینہ مرا طوفان میں چھوڑ آئے

کیا اس سے زیادہ ترا نقصان ہو صیاد
ہم تیرے پرندوں کو گلستان میں چھوڑ آئے

نکلے جو ترے گھر سے تو کچھ بھی نہ لیا ساتھ
ہم جان بھی اپنی ترے سامان میں چھوڑ آئے

حمد و غزل و مثنوی و مرثیہ و نعت
کیا کیا نہ لکھنؤ کے دبستان میں چھوڑ آئے

کچھ بھی نہ بچا تیرِ ستم تن میں ہمارے
جتنا تھا لہو سب ترے پیکان میں چھوڑ آئے

جاں دینے کو بے چین تھے جس پر وہ وفادار
رن پڑتے ہی تنہا اسے میدان میں چھوڑ آئے

○

ہم اپنے ملکِ قناعت میں قیصری بھی کریں
فقیر بن کے رہیں اور سکندری بھی کریں

رکھا ہے سر پہ اگر عشق کا یہ تاج تو ہم
تمہاری سلطنتِ دل میں سروری بھی کریں

کہو شہاں سے کہ رکھیں دکھے ہوؤں کا خیال
ملا ہے تخت تو کچھ بندہ پروری بھی کریں

قریب ہیں جو خدا سے وہ اس سے دور بھی ہیں
اگر ہے بندگی لازم تو کافری بھی کریں

بچھائیں بوریا اپنا تو پاس تیغ بھی ہو
سپہ گری بھی کریں اور قلندری بھی کریں

عجب ہیں شہر میں یہ میرے چاہنے والے
مجھے بلند کریں اور ہمسری بھی کریں

ہے دلبروں کا عجب کارگاہِ عشق میں طور
کہ توڑیں آئنہ اور آئنہ گری بھی کریں

کمال اور کیا اب اس سے بڑھ کے ہوگا انیس
کمائیں رزق بھی اپنا سخنوری بھی کریں

○

عکس ہر منظر کا جب تک چشم روشن میں رہے
حرف میں تیرے اُجالا روشنی فن میں رہے

اس سے بڑھ کر اور مرا کیا ہوگا شاہانہ سفر
پاؤں میں زنجیر ہو اور طوق گردن میں رہے

ایک سے منظر میں ہر موسم نظر آتا نہیں
وہ قفس کا حال کیا جانے جو گلشن میں رہے

اتنی اونچی مت اٹھا دیوار رک جائے نہ دھوپ
اک کرن خورشید کی میرے بھی آنگن میں رہے

شہر میں گھمسان کا رن پڑ رہا ہے ہر طرف
کیوں مرا خوں جمع ان روزوں مرے تن میں رہے

جو مری اپنی ہو وہ تھوڑی سی دولت بھی بہت
ایک ہی ہو پھول لیکن میرے دامن میں رہے

دیکھتے رہتے تھے رہ رہ کر رہائی کی کرن
جتنے زنداں میں رہے اتنے ہی روزن میں رہے

کیا اسے ہو شہر میں اسباب لُٹ جانے کا خوف
جس کا ساماں سب کا سب صندوقِ رہزن میں رہے

لکھنؤ اپنے لیے کوفے سے کم تھا کب انیسؔ
ہر گھڑی اس شہر میں ہم چشمِ دشمن میں رہے

○

تو کیا ہوا جو گلا یہ رسن میں رہنے لگا
مزہ تو دانۂ حق کا دہن میں رہنے لگا

اسے تلاش تھی اجڑے ہوئے ٹھکانے کی
سو وہ غزال ہمارے بدن میں رہنے لگا

قیام پہلے کیا آ کے خانۂ دل میں
پھر اس کے بعد وہ میرے سخن میں رہنے لگا

مجھے بھی تیرے لیے کاٹنا تھا ایک پہاڑ
سو میں بھی تیشہ گہِ کوہکن میں رہنے لگا

ترے بدن سے یہ کیوں روشنی نکلتی ہے
کوئی ستارہ ترے پیرہن میں رہنے لگا

بلند ہوتی نہیں اب کسی چراغ کی لو
یہ کون آ کے مری انجمن میں رہنے لگا

بنا ہے ایک ہی مٹی سے میرا تیرا بدن
تو اس میں کیا جو میں تیرے بدن میں رہنے لگا

مصنف کی دوسری تصنیفات

- اردو غزل میں علامت نگاری : (ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی)
- یگانہ : انتخاب (ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی)
- قائم چاند پوری : انتخاب (ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی)
- ادب کی باتیں : تنقیدی مضامین
- کوّے اور کالا پانی (ترجمہ) : نرمل ورما، بہ اہتمام ساہتیہ اکادمی، دہلی
- مسعود حسن رضوی ادیب (مونوگراف) : بہ اہتمام ساہتیہ اکادمی، دہلی
- بحث و تنقید : تنقیدی مضامین
- غزل کا نیا علامتی نظام : (ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی)
- روحِ انیس : مسعود حسن رضوی ادیب
  تصحیح و ترتیب و پیش گفتار : بہ اہتمام ساہتیہ اکادمی، دہلی
- خوشبوئے خاک : رپورتاژ
- دُکھیارے : ناولٹ
- در شہرِ دوستداراں : یادنامہ، کراچی
- کتنے پڑھنے والے : افسانے
- خواب سراب : ناول
- ضرب الامثال : مسعود حسن رضوی ادیب
  تصحیح و ترتیب و پیش گفتار : بہ اہتمام ساہتیہ اکادمی، دہلی
- پری ناز اور پرندے : ناول

زیر اشاعت

- ادب کی باتیں : تنقیدی مجموعہ (دوسرا ایڈیشن)
- تنقیدی مضامین
- خاکے

EIK NAIZA KHOON-E-DIL

Anis Ashfaq